www.urducouncil.nic.in
قیمت : -/10 ₹
آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi
مارچ 2021
عالمی یوم خواتین مبارک

# ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

## قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

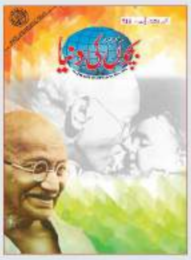

**ان کے علاوہ:**

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

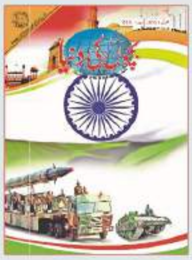

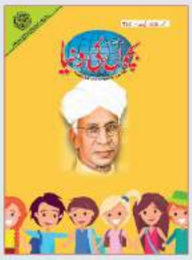

**سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ**

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 1-5، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

# اس شمارے میں


| | | | |
|---|---|---|---|
| اداریہ | مشعل | مدیر | 4 |
| شخصیت | صالحہ عابد حسین | صوفیہ محمود | 5 |
| نکہت سخن | شاعرات کے منتخب اشعار | | 9 |
| جہانِ نسواں | اکیسویں صدی کی شان: ''اردو زبان'' | پروفیسر رفعت جمال | 10 |
| | نذر سجاد حیدر اور ان کی افسانہ نگاری | ڈاکٹر محمد جابر حمزہ | 13 |
| | معاشی تفریق اور صحتمند معاشرہ | معصوم زہرا | 18 |
| | غالب کے اردو فارسی کلام میں عشقیہ مضامین | منیرہ نژاد شیخ | 21 |
| | طارق چھتاری کی افسانہ نگاری | شیبا پروین | 28 |
| | خواتین میں تعلیمی خود انحصاری کے رجحانات | امام الدین | 35 |
| | اکیسویں صدی میں جموں و کشمیر کی خواتین افسانہ نگار | مسرت آرا | 39 |
| کہانیاں | راحت جاں | شہانہ اقبال | 44 |
| | پھوٹری | ڈاکٹر فرخندہ ضمیر | 50 |
| حسن سخن | ہاجرہ خاتون، کائنات بخشی | | 53 |
| باورچی خانہ | لذیذ پکوان | | 55 |
| صحت | سن یاس | ڈاکٹر سید محمد عباس رضوی | 57 |
| آرائش و زیبائش | حسن کی نگہداشت | | 59 |
| تاثرات | تاثرات نگر نگر سے | | 61 |
| خواتین خبرنامہ | | | 62 |



آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 5 شمارہ: 3 مارچ 2021

**مدیر اعلیٰ** : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

**مدیر منتظم** : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

**مشیر** : ڈاکٹر مسرت

**ناشر اور طابع**

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

**صدر دفتر**

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

**شعبۂ فروخت**

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، بچھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

# مشعل

اب اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ خواتین کے بارے میں مثبت سوچ اور ترقی کے نئے راستے وا ہوئے ہیں۔ طویل مدت تک سماجی، معاشی اور نابرابری کا جبر سہتے سہتے ان میں بیداری آئی ہے۔ اسی کے زیر اثر انھوں نے اپنے حقوق کے لیے انقلاب کا بگل بجا دیا۔

تمام رکاوٹوں کے باوجود خواتین کی تعلیم کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں خواتین نے اپنی کوششوں سے ترقی کے منازل طے کیے ہیں۔ خود انحصاری نے انھیں زندگی کے میدان میں آگے بڑھنے کا حوصلہ فراہم کیا ہے۔

زندگی کے اہم شعبوں مثلاً میڈیا، کارپوریٹ، ادب، سائنس، ٹیکنالوجی، تدریس، سیاست میں خواتین کی نمائندگی ہو رہی ہے جو ان کے بہتر مستقبل کی ضامن ہے۔ ان شعبوں میں ان کی نمائندگی ان کو خود انحصار بناتی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے راہیں بھی ہموار کرتی ہے۔

معاشرے میں ایسی خواتین بھی ہیں جنھوں نے منفی سوچ کو ختم کر کے معاشرے کے نئے چیلنجز کو قبول کیا اور ہر مشکل کا ہمت سے مقابلہ کیا اور پرخار راستوں سے گزرتے ہوئے اپنے وجود کا اثبات کیا اور معاشرے میں اپنا مقام بنایا۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ معاشرے کا رویہ بھی ان کے تئیں آہستہ آہستہ تبدیل ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ذات اور معاشرے کے بارے میں اظہار خیال کرنے لگی ہیں۔ مختلف میدانوں میں ان کی نمایاں کارکردگی یہ باور کراتی ہے کہ وہ بھی کسی سے کمتر نہیں ہیں بلکہ مثبت سوچ اور فکر کے ساتھ وہ آگے بڑھ سکتی ہیں اور اپنے مستقبل کو تابناک بنا سکتی ہیں۔ سماجی، سیاسی اور معاشی طور پر بھی ان میں بیداری آئی ہے اور وہ ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر بھی خواتین کی صورتحال میں تبدیلی آئی ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں خواتین کی خود انحصاری ملک کی ترقی میں نئے باب رقم کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

مگر اب بھی کچھ مسائل ہیں جن پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے خاص طور پر تعلیم نسواں ایک اہم مسئلہ ہے۔ خواتین کی تعلیم کو بنیادی ترجیحات میں شامل کیا جائے اور خواتین کو مزید بااختیار بنایا جائے تو وہ معاشرے میں بہت سی تبدیلیاں لا سکتی ہیں۔ خواتین کو بھی چاہیے کہ سماجی مسائل پر بھی وہ اپنی نگاہیں مرکوز رکھیں اور روز بہ روز ہونے والی نئی نئی تبدیلیوں سے بھی آشنا رہیں اور معاشرے کو بہتر بنانے کی سمت میں اپنا بھرپور تعاون دیں۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

شخصیت

# صالحہ عابد حسین

صوفیہ محمود

شہر پانی پت میں انصاریوں کا محلّہ، جو ملک ہندوستان کے دارالحکومت دہلی سے تقریباً 80 کلومیٹر دور واقع ہے۔ وہاں اردو کے پہلے نقاد پیدا ہوئے جنھیں دنیائے اردو ادب مولانا الطاف حسین حالی کے نام سے جانتی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کی پسرزادی مشتاق فاطمہ اور نواسے غلام الثقلین کے آنگن میں 18 اگست 1913 کو ایک ننھی منی سی بچی نے قدم رکھا جسے آج ہم صالحہ عابد حسین کے نام سے جانتے ہیں۔ گھر کے بزرگوں نے نام دیا ''مصداق فاطمہ'' اور یہی ان کا اصل نام تھا لیکن دنیائے ادب میں صالحہ عابد حسین کے نام سے شہرت پائی۔

مصداق فاطمہ نے ایک پڑھے لکھے گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے پرنانا مولانا الطاف حسین حالی اردو کے مشہور شاعر و ادیب اور مصلح قوم ہیں، جنھوں نے عورتوں کی تعلیم، آزادی اور حقوق کے لیے اپنا خون جگر صرف کیا تب جا کر عورتوں کو وہ مقام نصیب ہوا جس کی وہ مستحق تھیں۔ ان کے والد غلام الثقلین بہ حیثیت وکیل معروف و مشہور تھے۔ انھوں نے ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس غرض سے کئی رسالے بھی نکالے۔ ابھی مصداق فاطمہ شیر خوار بچی ہی تھیں کہ ان کے والد نے اس جہان فانی کو خیر باد کہا۔ والد کے جانے کا غم ابھی انھوں نے محسوس کرنا شروع ہی کیا تھا کہ عمر کے چودھویں برس والدہ صاحبہ نے بھی داغ مفارقت دیا۔ ابھی ماں کی جدائی کا غم تازہ ہی تھا کہ سالِ نو کی آمد سے پہلے ہی بڑی بہن عین عنفوان شباب میں انتقال کر گئیں۔ ان پے در پے صدموں نے انھیں بچپن سے ہی سنجیدہ اور متین بنا دیا۔

صالحہ عابد حسین کی ابتدائی تعلیم کا آغاز علی گڑھ سے ہوا لیکن والدہ کے انتقال کے بعد انھیں واپس پانی پت لوٹنا پڑا۔ پھر دو تین سال کے وقفہ کے بعد انھوں نے حالی مڈل اسکول سے مڈل پاس کیا۔ جب 1929 میں ان کے بڑے بھائی غلام السیدین کی شادی ہوگئی تو مصداق فاطمہ مستقل طور پر علی گڑھ میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے لگیں۔ ان کے مطالعے میں اردو، فارسی اور انگریزی ادب شامل تھا۔ ابھی وہ تعلیم حاصل کر رہی تھیں کہ گھر والوں کو ان کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً انیس سال کی رہی ہوگی۔ ڈاکٹر عابد حسین سے ان کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد وہ دہلی آ گئیں اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

صالحہ عابد حسین جس وقت رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئی تھیں اس وقت ان کی عمر کم تھی لیکن شادی کے بعد بہت جلد ہی انھوں نے اپنی

خانگی ذمہ داریوں کو سمجھ لیا اور انھیں بہ خوبی نبھانے لگیں۔ان کا خاندان بڑا، ذمہ داریاں لامحدود اور آمدنی کے ذرائع محدود تھے۔مالی آسودگی ان کو کبھی نصیب نہ ہوسکی۔مگر مہمان نوازی، دوسروں کی مدد کرنے اور قرض دینے کے جذبے نے دیکھنے والوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ یہ لوگ آسودہ حال ہیں؟لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔آمدنی محدود اور خرچ اس سے کہیں زیادہ تھا۔بہر حال کسی نہ کسی طرح گزر ہو ہی جاتی تھی ۔1934 میں انھیں ماں بننے کا شرف حاصل ہوالیکن بچی اس دنیا میں آتے ہی اللہ رب العزت کو پیاری ہوگئی۔ان کو اس بات کا بے حد ملال رہا کہ اس کے بعد ان کو کوئی اولاد نصیب نہیں ہوئی۔اولاد کی محرومی کا درد ان کی تحریروں میں جا بجا جھلکتا ہے۔اسی طرح ان کی زندگی پر ابتدا تا انتہا غموں اور دکھوں کی کڑی دھوپ چھاؤں رہی۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عبادت وریاضت، تعلیمی کام کرنے اور دوسروں کی مدد خاص طور پر بچوں کی خدمت اور محبت میں لگا دیا۔

جہاں تک صالحہ عابد حسین کے ادبی ذوق کا معاملہ ہے تو یہ انھیں ورثے میں نصیب ہوا تھا۔وہ اپنے پرنانا خواجہ الطاف حسین حالی سے بہت متاثر تھیں یہی وجہ ہے کہ حالی کی طرح انھوں نے بھی کبھی ادب کے اصلاحی پہلو سے صرف نظر نہیں کیا۔حالی مرزا غالب کی سوانح ''یادگار غالب'' لکھ کر شہرت دوام حاصل کر چکے تھے۔صالحہ عابد حسین نے حالی کی اس یادگار زمانہ تصنیف کو سامنے رکھ کر خود حالی کی سوانح ''یادگار حالی'' کے عنوان سے لکھی اور حالی شخصیت اور ان کی علمی وادبی خدمات کا بڑی ہی خوبی کے ساتھ احاطہ کیا۔جب بھی حالی پر کوئی بھی تحقیقی وتنقیدی کام ہوگا ''یادگار حالی'' سے ضرور استفادہ کیا جائے گا۔

''سلسلۂ روز وشب'' ان کی خاصی ضخیم خودنوشت ہے جو 336 صفحات پر مشتمل ہے۔اپنی اس خودنوشت کو صالحہ عابد حسین نے چوبیس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔یہ خودنوشت صالحہ عابد حسین کی زندگی کے بے شمار گوشوں کو اپنے احاطۂ تحریر میں لاتی ہے۔وہ ایک فکشن نگار ہیں اس لیے انھوں نے اپنی داستان حیات وتجربات زندگی کو ناول کے انداز واسلوب میں لکھا ہے۔صالحہ عابد حسین کی خودنوشت ایک بھرپور ومکمل خودنوشت ہے جس کے مطالعے سے ان کی زندگی کے احوال، ان کے خاندان واہل خاندان، ان کے وطن پانی پت اور اس عہد میں مسلم گھرانوں کی تہذیب اور رسم ورواج سب سے واقفیت ہوتی ہے۔طوالت کے باوجود یہ خودنوشت اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے دلچسپ معلومات فراہم کرتی ہے۔صالحہ عابد حسین نے ''سفر زندگی کے لیے سوز وساز'' کے عنوان سے سفرنامہ بھی لکھا ہے، یہ اس سفر پر مشتمل ہے جو انھوں نے اپنے شوہر عابد حسین کے ساتھ کیا تھا۔یہ سفرنامہ قلم پر ان کے عبور کو ظاہر کرتا ہے۔اس کو پڑھ کر گویا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام خوش کن مناظر آنکھوں کے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔''جانے والوں کی یاد آتی ہے'' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے اپنے عزیز دوستوں اور رفیقوں کا ذکر اس طرح خون جگر میں قلم ڈبو کر کیا ہے کہ آنکھیں بھر آتی ہیں۔صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے جن لوگوں کے بارے میں لکھا ہے ان سب سے ان کا ایک قلبی تعلق اور دیرینہ لگاؤ رہا ہے۔

انھوں نے ناول کے علاوہ افسانے، ڈرامے، سوانح حیات، خودنوشت، خاکہ اور تنقیدی مضامین قلم بند کیے لیکن ان کے فن کا جوہر پوری طرح ناولوں میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ان کے ناول عذرا، راہ عمل، قطرے سے گہر ہونے تک، آتش خاموش، اپنی اپنی صلیب، گوری سووے سیج پر، الجھی ڈور، یادوں کے چراغ اور ساتواں آنگن ہیں۔ان ناولوں میں ہندوستان کی مٹتی ہوئی قدیم تہذیب اور نئی تہذیب سے اس کے ہم آہنگ ہونے کو موضوع بنایا گیا ہے۔وہ اپنے ناول 'عذرا' کے پہلے باب کا آغاز اس طرح کرتی ہیں:

''قصبہ اکبر پور اشراف ٹولے میں وقت رات کا سناٹا مسلط ہے ہاں ایک گلی میں جس کے سامنے ایک بڑا سا مقفل

پھاٹک اور ادھر اُدھر متوسط طبقے کی ڈیوڑھیاں ہیں.......
سارے گھر میں خاموشی طاری ہے البتہ چبوترے پر بچھے
ہوئے لکڑی کے تخت پر کوئی نماز پڑھ رہا ہے۔ لالٹین کی روشنی
سے اتنا پتہ چلتا ہے یہ تہجد گزار انسان کوئی دبلی پتلی عورت
ہے۔ نہایت خشوع اور خضوع سے نماز کے بعد ہاتھ اٹھائے
دعا میں محو ہے۔''

(عذرا، صالحہ عابد حسین، ص۔10۔9، ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، اشاعت 1987)

اسی طرح ان کی تحریروں میں مغربی اور نئی تہذیب کی اندھی تقلید کرنے اور دنیاوی عیش وعشرت اور دولت کی بیجا حرص وہوس سے نجات حاصل کرنے کی تلقین بھی ملتی ہے۔ ناول ''آتش خاموش'' کی کردار انجم کا یہ جملہ دیکھیں:

''جس ملک میں کروڑوں آدمیوں کو ایک وقت بھی پیٹ بھر
کھانا نصیب نہ ہوتا ہو وہاں کسی کو کیا حق ہے کہ ہزاروں
روپیہ اپنی ذات پر خرچ کرے اور دوسروں کا گلا کاٹے۔''

(صالحہ عابد حسین، آتش خاموش، ص۔236، نسیم بکڈ پو لکھنو، اشاعت 1982)

صالحہ عابد حسین کا یہ خیال ان کے ترقی پسندانہ نظریے کو بیان کرتا ہے۔ انسانیت، آزادی، سماجی انصاف اور انسانی حقوق، ان کی تحریروں کے اہم ستون ہیں، وہ جس وقت سنِ بلوغت کی طرف بڑھ رہی تھیں اس وقت ہمارے معاشرے میں سیاسی، سماجی اور معاشی افراتفری کے ساتھ ہی ساتھ دولت کی ہوس اور نئی و پرانی نسل کے درمیان کشاکش اپنے عروج پر تھی۔ مصنفہ کی نظر اس طرف بھی جاتی ہے۔ ناول ''گوری سوئے سیج پر'' میں اسی موضوع کو نوک قلم پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بوڑھے لوگوں کو فضول و بیکار انسان سمجھ کر گھر بدر کر دیا جانا اور فیملی کے دائرے میں صرف میاں بیوی اور بچوں کا شمار کیا جانا ہی اس ناول کا موضوع ہے۔

صالحہ عابد حسین کا تعلق جس عہد سے ہے اس عہد میں فکشن میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ نئے لکھنے والوں میں جوش و ولولہ اور قوم وملت کو گمراہی سے نکالنے کا جذبہ تھا۔ اردو کا افسانوی ادب تبدیلی کی جن جن راہوں سے گزرا، یہ ساری راہیں اس وقت کی خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں نظر آتی ہیں۔ حجاب امتیاز علی، اکبری بیگم، نذر سجاد حیدر اور دوسری خواتین قلم کاروں نے جس طرح اپنی تحریروں میں نسوانی کرداروں کو جگہ دی ہے اور ان کے مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا غلط نہ ہوگا کہ سرسید اور حالی جیسے مشاہیر کی وہ کاوشیں ہی اس کا سبب تھیں جوان حضرات نے تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں کی تھیں۔ ان خواتین قلمکاروں نے ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ راشد الخیری کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے نئے موضوعات اور نئے اسلوب اظہار کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری کی ہیروئن 'چراغ خانہ' ہے، وہ گھریلو تعلیم اور سلیقہ شعاری کو ہی امور خانہ داری کے لیے اہم سمجھتے ہیں۔ اس کے برخلاف صالحہ عابد حسین اور چند خواتین تخلیق کاروں نے خواتین کے لیے ایک نئی زندگی کا خواب دیکھا۔ مردوں کے قدم سے قدم ملا کر چلنا، نئی تعلیم و تہذیب سے بہرہ ور ہونا، آزادی اور اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانا اور ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنے کی دعوت ان خواتین اہل قلم نے دی ہے۔ مثلاً عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں بہت عرق ریزی کے ساتھ متوسط مسلم معاشرے کی عورتوں اور لڑکیوں کے نفسیاتی وجذباتی رویوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ عصمت کی ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں میں صالحہ عابد حسین، ممتاز شیریں، شکیلہ اختر وغیرہ بھی سماجی حقیقت نگاری کے نقطۂ نظر سے نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ پھر یہ روایت رضیہ سجاد ظہیر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، جمیلہ ہاشمی اور قدسیہ بانو جیسی ممتاز خواتین قلم کاروں سے ہوتی ہوئی آج کی خواتین ناول وافسانہ نگاروں تک پہنچتی ہے۔

صالحہ عابد حسین کے فکشن کے مطالعے سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عصری حسیت کو کہانی کے سانچے میں ڈھالنے کا فن جانتی تھیں۔ دراصل ادب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ماحول اور زندگی کی سچی تصویریں، روزمرہ کے حالات، گردوپیش کے واقعات کو بخوبی سمویا جاسکتا ہے۔ میں یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کر رہی ہوں کہ صالحہ اور عصمت کی دنیا تقریباً ایک جیسی ہی نظر آتی ہے لیکن صرف موضوع میں فرق ہے۔ عورتوں کی مظلومیت کو بیان کرتے ہوئے صالحہ عابد حسین نے بھی اپنے گردوپیش کے واقعات وحادثات اور گھریلو زندگی کے روزمرہ کے حالات کو بڑے ہی دل پذیر انداز میں بیان کیا ہے۔ مصنفہ کی شخصیت کی طرح ان کا فن بھی ایک پرسکون ندی کی مانند خاموش ہے۔ ان کی حقیقت نگاری میں منشی پریم چند کا رنگ جھلکتا ہے۔ انھیں بھی پریم چند کی طرح کسانوں، غریبوں، مزدوروں کے حالات، بے چینی واضطرابی کیفیت سے ہمدردی ہے۔ ان کا قلم کمزوروں کی حمایت میں برابر اٹھتا رہا ہے۔ سماج کی توجہ انھوں نے عورتوں کے مسائل کی طرف مبذول کی ہے لیکن پریم چند کے افسانہ 'کفن' کی طرح برہنہ حقیقت نگاری سے وہ کافی دور نظر آتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بہرحال ایک عورت تھیں اور ایک خاتون تخلیق کار اگر وہ ایک میانہ روی کی قائل ہے تو کہیں نہ کہیں تلخ اور سنگین حقائق سے صرف نظر کر ہی جاتی ہے۔

صالحہ عابد حسین علم وادب کی بے لوث خدمت گزار تھیں۔انھوں نے معاشرہ کی ذہنیت کو اپنے فن پاروں کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔صحیح معنوں میں فن کار وہی ہوتا ہے جس کا فن ہر زمانے میں زندہ رہے۔صالحہ عابد حسین کا تعلق جس وقت اور سماج سے تھا اسے مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم ان کے فن کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کی فضا میں خواتین سے متعلق مسائل موضوعِ بحث تھے۔خواتین قلم کاروں میں رشید جہاں، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں احتجاج اور انتقام کی شدت ہے۔کچھ فکشن نگاروں کے یہاں یہ شدت اپنی حدود سے بڑھ گئی ہے، ایسی شدت سے صالحہ عابد حسین نے خود کو محفوظ رکھا ہے۔مشرقی تصور اخلاق ان کے ذہن میں ہے۔وہ نسوانی قوت کی قائل ہیں لیکن خود ان کے نسوانی کردار ان کے ناولوں اور افسانوں میں اپنی صنفی قوت کا اس طرح احساس نہیں دلاتے جس طرح عصمت چغتائی کے یہاں ہمیں ''دشمن'' وغیرہ کے کردار میں یہ چیزیں نظر آتی ہیں۔عصمت کے مقابلے میں ان کا اسلوب اظہار بھی خاصا متوازن ہے۔مثلاً ان کے ناول 'قطرے سے گہر ہونے تک' کا یہ جملہ دیکھیں جو انیس، اوشا سے کہتی ہے:

''پیاری بہن مسرت پڑی نہیں مل جاتی اس کے لئے آدمی کو بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے، بڑے تپسیا کی ضرورت ہے، ضبط و صبر کا امتحان دینا پڑتا ہے۔''

(قطرے سے گہر ہونے تک، ص۔245، صالحہ عابد حسین، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، اشاعت 1985)

صالحہ عابد حسین ایک حساس تخلیق کار ہیں۔وہ نفسیاتی الجھنوں سے کوسوں دور نظر آتی ہیں۔ان کی انسان دوستی اپنی مثال آپ ہے۔انھوں نے جس طرح خانگی معاملات کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہیں وہ فطری بھی ہیں اور دلکش بھی۔اسی طرح ان کی نظر سیاسی و سماجی حالات پر بھی مرکوز رہتی ہے۔ان کی تحریروں میں ہندوستانی تہذیب وتمدن کے ہر پہلو کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔جہاں وہ ایک طرف معاشرے کی ترقی کے لیے عورتوں کی تعلیم، مذہب کی پاسداری، انسانی حقوق، اور سماجی برابری کی باتیں کرتی ہیں تو دوسری طرف معاشرے کی پستی و زبوں حالی کی طرف توجہ مرکوز کراتی ہے۔بزرگوں کی ناقدری، شادی بیاہ کی بیجا رسموں، جہیز اور تلک کی لعنت، منھ زور شوہروں کی بالادستی، منگنی اور طلاق کی صورتیں، طعام وقیام کی الجھنیں، یہ تمام امور انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش کیے ہیں۔

صالحہ عابد حسین تصنع و بناوٹ سے کوسوں دور نظر آتی ہیں۔ان میں بناوٹ اور تصنع نہیں ہے۔ان کا فلسفہ حیات ہی جداگانہ رہا ہے۔صالحہ عابد حسین پرانی اور نئی قدروں کے بیچ معلق نظر آتی ہیں اگر ایک طرف وہ ماضی کی ترجمان تھیں تو دوسری جانب نئے سوالوں اور نئی سچائیوں کو پرکھنے سمجھنے اور برتنے کے ہنر سے بھی واقفیت رکھتی تھیں۔انھوں نے اپنی تخلیقات میں غمِ جاناں کو غمِ دوراں بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کی زبان و بیان کی سلاست، روانی اور پاکیزگی خود ان کی طبع سلیم اور ذوق سلیم کی پیداوار ہے۔صالحہ عابد حسین کے مضامین میں قدیم اور جدید تہذیبی اقدار کی کشمکش کا شعور دراصل زمانے کی تغیرات کی دین ہے۔گہرے سماجی اور اخلاقی شعور کی مدد سے نئی اور پرانی قدروں کو اس میں سمونے کی کوشش کو مصنفہ کی خاندانی روایت کا ہی تسلسل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اردو زبان وادب سے ان کی بے پناہ محبت وعقیدت کا یہ اعجاز ہے کہ مسلسل خرابی صحت کے باوجود ان کا قلم کبھی نہیں رکا اور وہ زندگی کی آخری سانسوں تک کچھ نہ کچھ لکھتی رہیں۔ادب سے بے لوث محبت اور خاموش ادبی خدمت پر حکومت ہند نے انھیں 'پدم شری' کا اعزاز دیا۔غالباً اس ایوارڈ کے علاوہ بھی کئی اور ایوارڈز سے انھیں نوازا گیا۔ان اعزازات کے باوجود ان کی مزاجانہ سادگی اور انکساری میں کبھی بھی فرق نہیں آیا اور وہ آخر دم تک 'عابد ولا' کے پرسکون گوشے میں بیٹھ کر اردو ادب کی خاموشی سے خدمت کرتی رہیں۔انھیں نہ ستائش کی تمنا تھی اور نہ ہی صلے کی پرواہ۔

صالحہ عابد حسین کی صحت عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ خراب رہنے لگی تھی۔ڈاکٹر عابد حسین کے انتقال کے بعد تو وہ بالکل ہی ٹوٹ گئی تھیں۔ان کی خواہش تھی کہ وہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کریں، اللہ نے ان کی یہ آرزو بھی پوری کی اور انھوں نے اس فریضے کو بھی ادا کیا۔1983 میں وہ اپنے ایک عزیز کی بیٹی ڈاکٹر 'عذرا' کی فرمائش پر امریکہ بھی گئیں۔ڈاکٹر عذرا نے ان کی بے حد تیمارداری کی جس کی وجہ سے وہ صحت یاب ہو گئی تھیں لیکن ہندوستان واپس آ کر پھر بیمار رہنے لگیں۔دن بدن ان کی صحت خراب ہوتی چلی گئی۔دمہ کا مرض اب لاعلاج ہو چکا تھا۔ڈاکٹروں کے مشورے پر جنوری 1988 میں انھیں اسپتال میں داخل کیا گیا لیکن کوئی دوا کام نہیں آئی اور 8 جنوری 1988 کو جب وہ اپنے عزیزوں سے محو گفتگو تھیں کہ اچانک دل کا دورہ پڑا اور انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔□□

**Sufia Mahmood**

Research Scholar

Dept. of Arabic, Persian, Urdu

Bhasha Bhawan

Vishwabharti University

Shantiniketan-731235 (W.B)

# شاعرات کے منتخب اشعار

زلف سے پوچھو پریشانی مری
اور آئینہ سے حیرانی مری

ہو گئی اس پر توجہ غوث کی
جو چمکتی ہے یہ پیشانی مری

راضیہ خاتون جمیلہ

پیکر اضطراب ہے دنیا
میرے دل کا جواب ہے دنیا

آہ اس آنکھ کی گراں خوابی!
جو یہ سمجھی ہے خواب ہے دنیا!!

زیب عثمانیہ

قصہ عہد شباب رہنے دے
بیان ماضی خراب رہنے دے

ساقی بے خبر سے دل تنگ ہے
دور صہبا شراب رہنے دے

نثار فاطمہ کبریٰ

تیری حیات دائمی، روح تری ہے "لایموت"
یہ عارضی نمود تھی، تیرے ثبات کا ثبوت

تیرا خلوص یاد ہے، تیرے پیام یاد ہیں
تو ان کے ساتھ ساتھ ہے، تیرے غلام شاد ہیں

بشیرالنساء بیگم بشیر

کہا میں نے کہ جنت پر رضائے دوست فائق ہے
رضائے دوست بولی بے خبر میں ہی تو جنت ہوں

جا کے تو اپنے ہوا خواہوں کا دل ٹھنڈا کر
خانہ بربادوں سے کیا چھیڑ نسیم سحری

زاہدہ خاتون شروانیہ

مجھے بھی بادۂ توحید، ساقیٔ کوثر
پلا دے آنکھوں میں آنکھوں سے جام کے بدلے

شفا جس سے بیمار الفت کی ہوتی
کہیں ایسا یارب مسیحا نہ دیکھا

صالحہ بیگم مخفی

نہ جانے کیا سمجھ کر ہنس پڑے ہیں
یہ ہے تمہید ذوق اعتنا کیا

نہ ہونا بھی بقدر یک نفس ہے
ہماری ابتدا کیا انتہا کیا

رابعہ پنہاں

چمن وہی ہے، گھٹائیں وہی، بہار وہیں
مگر گلوں میں وہ اب رنگ و بو نہیں باقی

گلے تو ملتے ہیں احباب اے حیا اب بھی
مگر حالوں میں صداقت کی بو نہیں باقی

حیا لکھنوی

پروفیسر رفعت جمال

# اکیسویں صدی کی شان
# اردو زبان

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے یہاں مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے۔ مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں، مختلف تہذیبی اقدار ہیں۔ دنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں جس کے ماننے والے سرزمین ہند پر نہ بستے ہوں۔ اس کثرت اور رنگارنگی کے باوجود کچھ ایسی مشترک اقدار ہیں کہ الگ الگ ہوتے ہوئے بھی سب یک رنگ ہیں۔ آرین، یہودی، مجوسی، یونانی اور مسلمان۔ مختلف مذہب وملت کے لوگ یہاں آکر آپس میں اس طرح گھل مل گئے کہ ان کے درمیان مذہب، زبان اور رسم ورواج کے فاصلے بھی مٹ گئے۔

خاص طور سے مسلمان آریوں کے مانند فاتح بن کر ہندوستان آئے لیکن ان کو یہاں کی آب وہوا ایسی راس آئی کہ یہیں کے ہوگئے۔ آریوں کے بعد جس تہذیب نے اس ملک کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اسلامی تہذیب تھی ان دونوں تہذیبوں کے میل سے ایک نئی تہذیب نے جنم لیا جس کو ''ہندوستانی تہذیب'' کہا گیا۔ اس تہذیب نے بھائی چارے، محبت ورواداری اور ایک دوسرے کے مذہب کا احترام سکھایا، آپس میں یکجہتی بھی پیدا کی، ایک زبان بھی دی جس کا نام بعد میں اردو پڑا۔ ''نخل اردو'' کی آبیاری میں ہر مذہب وملت کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کو پروان چڑھایا یہ سوچ کر کہ:

زندگی کو ایک تازہ زندگی دیتے چلو
وقت کو فکر و نظر کی روشنی دیتے چلو

اردو کے ذریعہ ان لوگوں نے سماج کو ایسی تازگی عطا کی جس سے فکرونظر میں بلندی پیدا ہوئی اور اردو ہندومسلم اتحاد کی علامت بن گئی جس نے آزادی کی جنگ لڑی، انقلاب کا نعرہ دیا۔ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا لہٰذا اس کی ترقی کے لیے ہندومسلم، سکھ عیسائی سب پیش پیش رہے۔ اردو ایک شائستہ شیریں اور شگفتہ زبان ہے اس لیے کسی نے کہا کہ:

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے
ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے

اس میں شک نہیں کہ اردو زبان نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ سب سے جدا اور اہم ہیں جس سے اس کے مخالفین بھی انکار نہیں کرسکتے۔ ہماری تقریباً ایک ہزار سال پرانی تہذیب وتمدن کی شاہد یہی زبان ہے۔ آزادی کی پوری داستان اس کے پہلو میں سورہی ہے مگر ہم اس سے اس لیے آشنا نہیں کہ ہم اردو نہیں جانتے۔ شاید اسی لیے ہمیں اس زبان سے دور کیا گیا کہ ہم اپنے ماضی سے بے خبر ہوجائیں چونکہ ''جو قوم اپنے ماضی کو بھول جاتی ہے مستقبل اس کو فراموش کردیتا ہے'' کچھ ایسا ہی حال ہمیں اپنی قوم کا نظر آرہا ہے۔ جو اپنی تاریخ سے بے خبر، ماضی کے سنہرے

اوراق سے نا آشنا ایک کاہل اور رسوا قوم کے دائرے میں داخل ہوتی جا رہی ہے۔ اس نے اپنی مادری زبان سے چشم پوشی کر لی ہے۔ اب اس کو اپنے دل کی کھڑکیوں کو کھولنا ہوگا اور دماغ کی آنکھوں سے تاریخ کے پورے منظر نامہ پر نظر ثانی کرنی ہوگی، تب ہی کچھ بات بنے گی۔

زبان ایک ایسا آئینہ ہے جس میں کسی قوم کے افکار و خیالات، تہذیب و معاشرت اور عقائد و نظریات کے عکس جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں زبان کی بڑی اہمیت ہے، زبان ہی ہمارے ماضی، حال اور مستقبل کی محافظ ہوتی ہے۔ لہٰذا ماضی سے رشتہ برقرار رکھنے اور تابناک ''مستقبل'' کے لیے ہمیں اردو زبان کو گلے لگانا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ یہی اکیسویں صدی کی پکار ہے۔ چونکہ ''زبان'' ہی انسان کے خیالات میں یکسانیت پیدا کرتی ہے جبکہ اختلاف کی صورت میں اپنے بھی غیر ہو جاتے ہیں۔ یعنی زبان تہذیب اور قومیت کی بقاو فنا میں بڑی حد تک فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم کو برباد کرنا ہو تو اس کی زبان تبدیل کر دیجیے آہستہ آہستہ وہ قوم خود دوسرے سانچے میں ڈھل جائے گی، اس لیے آنند نارائن ملا نے کہا تھا:

''زبان میری ذات کا آئینہ ہے، میری میراث ہے، میری
تاریخ ہے اور میری زندگی ہے''

ان کے خیالات کی بازگشت سے محسوس ہوتا ہے کہ زبان کی تبدیلی سے انسان کے وجود کو خطرہ لاحق ہے۔ جس سے سب کچھ بدل جاتا ہے اور نئی نسل کا تعلق اپنے اسلاف سے بالکل ٹوٹ جاتا ہے، تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ قوم کی شیرازہ بندی کرنے کے لیے، ملک کی یکجہتی کے لیے ہمیں اکیسویں صدی کو اردو کی صدی بنانا ہوگا۔ سنسکرت پڑھ کر ہم اپنی سنسکرتی کو بچا سکتے ہیں اور اردو پڑھ کر حقیقت سے آشنا ہو کر اس ملک کے ہمالیہ کا سر بلند کر سکتے ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں:

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

یہ شوالہ ''مندر'' محبت کا پریت کا ہوگا چونکہ اس دھرتی پر رہنے والوں کی مکتی ''پریت''، یعنی محبت میں ہے۔ جس محبت کا سبق آج کی نئی نسل بھول گئی ہے یا جان بوجھ کر اس کو بھولنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ آج ہماری بے حسی کا یہ عالم ہے کہ سڑک پر ایک تڑپتا ہوا انسان پڑا ہے خون کے دھارے بہہ رہے ہیں مگر ہم کھڑے تماشائی بنے ہیں، اس کی مدد کو کوئی نہیں آتا۔ دھرتی کانپ رہی ہے، آسمان آنسو بہا رہا ہے مگر خود غرض انسان بت بنا کھڑا ہے۔ اس بت میں حرکت پیدا کرنے کے لیے، اس کو انسان بنانے کے لیے، اپنی اخلاقیات کو جلا دینے کے لیے ہمیں اکیسویں صدی میں اپنی مشرقی تہذیب کا پرانا بھولا ہوا سبق یاد کرنے کے لیے اردو کے دامن میں ہی پناہ ملے گی۔

زبان ہی انسان کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے، جو زبان ذہن پر سوار رہتی ہے خواب بھی اسی زبان میں آتے ہیں۔ انگریزی پڑھنے کے سبب ہماری نئی نسل انگریزی طرز زندگی کی عادی ہوتی جا رہی ہے۔ آج ہماری تہذیب پر انگریزی تہذیب بری طرح حاوی ہے۔ اعلیٰ مقابلے کے امتحانات کی کامیابی کی ضامن انگریزی زبان کو مانا جاتا ہے۔ لہٰذا انگریزی اداروں کے پروردہ بچے ہی اس میں کامیابی حاصل کرتے ہیں جن میں تعلیم کا تفہیمی عمل اور ذہن کو روشن کرنے والی قوت نہیں ہوتی اور ہمارے سماج میں اس قومی یکجہتی کی کمی ہوتی جا رہی ہے جس کو اردو نے فروغ دیا تھا، جس کی وجہ سے ہمارے سماج کا ارتقا ٹھہر گیا ہے اور آہستہ آہستہ ہماری شناخت بھی کھوتی جا رہی ہے۔ ہمیں اپنا تعارف خود سے کرانے کے لیے بھی اس زبان کو گلے لگانا ہوگا اور اس احساس کو جڑ سے اکھاڑنا پڑے گا کہ اردو زبان کسی سے کمتر نہیں ہے۔

دفاتر میں اردو کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی۔ اردو میں خط و کتابت کو ترجیح دینی ہوگی۔ چونکہ اردو ایک ایسے رابطے کی زبان ہے جس کو ہر طبقہ بہ آسانی سمجھتا ہے، جس میں ہر زبان کے الفاظ کو جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہے مگر افسوس اردو کی ترقی ایسے لوگوں سے وابستہ ہوگئی ہے جو مصلحت پسندی کا شکار ہیں۔ مصلحتوں نے انھیں تہذیبی و ثقافتی صداقتوں سے چشم پوشی پر مجبور کر دیا ہے اور انھوں نے اردو کے چراغ کو وقت کی آندھیوں کے سہارے جلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اپنوں کی بدسلوکی نے اردو کے درد میں اضافہ کیا۔ بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں کا مقابلہ کر کے بھی اردو نے اپنی روشنی کو مدھم نہیں ہونے دیا یہ اس کی سخت جانی کی دلیل ہے۔

اردو ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہے۔ آج ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہماری تعلیم علاحدگی پسندی کو ہوا دے رہی ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ملک کے سیاسی و سماجی تناظر میں ایسی تعلیمی پالیسی بنائیں جس سے علاحدگی پسندی کے بجائے فرقہ وارانہ ہم آہنگی پروان چڑھے یہ کام صرف اردو رہنما انجام دے سکتے ہیں۔

اردو کا ثقافتی پہلو بھی قابل توجہ ہے ہم جس ثقافتی ورثے کے مالک ہیں اس کا زیادہ تر حصہ اردو زبان میں ہے۔ ادب، شاعری، علم وفن، موسیقی و مصوری جیسے شعبوں کی ترقی میں اردو زبان کا بڑا حصہ ہے۔ گارساں دتاسی نے لکھا ہے:

''ہندستان کی عام بولیوں میں ہندوستانی اردو کا جاننا سب سے سودمند ہے، جو زبان ثقافتی، علمی وادبی، معاشرتی اور معاشی، مذہب اور سیاسی اور عملی زندگی کا اہم جزو ہو اس کی تدریسی اور تعلیمی اہمیت کے بارے میں شک وشبہات رکھنا عقلمندی کی دلیل نہیں ہے۔''

لیکن ہم نے آزادی کے بعد کے لمبے سفر میں سب سے زیادہ اردو سے آنکھیں چرائیں اور اس کے ساتھ ناانصافی کی۔ سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ رہا کہ ان ریاستوں میں جن کی سرکاری یا علاقائی زبان ہندی ہے وہاں اردو کی ابتدائی تعلیم کا سرے سے انتظام نہیں کیا۔ اگر کچھ کیا بھی تو وہ تسلی بخش نہیں۔ ہمارے اتر پردیش جیسی بڑی ریاست میں جو حشر اردو کا ہے اس کی ذمہ دار صرف، عوام ہے اور اردو اساتذہ بھی............

بڑے افسوس کی بات ہے ابھی حال میں عید الفطر کا مقدس مہینہ گزرا ہے اور یوپی کی مسجدوں میں عید الفطر تک ہندی میں لکھا تھا یعنی ''اردو رسم الخط'' ذہنوں سے غائب ہوگیا۔ آج کل کچھ مذہبی و دینی پروگرام چل رہے ہیں جس میں اردو کی جگہ ہندی یا انگریزی میں لکھا جاتا ہے ایسے حالات میں ضروری ہے کہ اردو کی بقا کے لیے ہم بچوں کو ''اردو رسم الخط'' سکھائیں چونکہ زبان کو پڑھنے میں اس کے رسم الخط میں جو لطف آتا ہے وہ دوسری زبان میں نہیں۔

اب تک اردو دوستوں نے صرف حکومتوں کی ہی توجہ دلائی ہے، اب اکیسویں صدی میں اردو کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کچھ ہم پر بھی ذمہ داریاں ہیں۔ ان کو نبھانے کی کوشش ہمارا فرض اولین ہونا چاہیے، ہمیں خود بھی عملی قدم اٹھانا چاہیے اور این سی پی یو ایل کے تحت جو تعلیمی مہم چھیڑی گئی ہے، اردو کو کمپیوٹر سے جوڑا گیا، انٹرنیٹ کا حصہ بنایا، ان کی مدد سے اپنے اپنے صوبے اور اپنے اپنے شہر میں اپنے طور پر قدم اٹھائیں۔ میں تقریباً 45-40 سال سے بنارس میں تدریس کا کام انجام دے رہی ہوں یہاں موسیقی کا بول بالا ہونے کی وجہ سے لڑکیاں غزل گانے کا شوق رکھتی ہیں اور میں نے بی۔ اے کے طلبا کو الف۔ ب سے رسم الخط سکھا کر اردو پڑھائی ہے۔ بچوں میں بڑا ذوق ہے اور اساتذہ تک سیکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لیے معقول انتظام ہو تو بات بنے۔ حکومت کے پروگرام کاغذ تک اگر محدود ہیں تو ان کو کارگر بنانے میں ہمیں اپنا کردار نبھانا ہوگا۔ عملی طور اردو کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی۔

(1) ہر شہر میں اردو کی ابتدائی تعلیم کا انتظام ہو۔

(2) ثانوی تعلیم سہ لسانی فارمولے کے ذریعے اردو تعلیم کو آگے بڑھانا چاہیے۔

(3) آٹھویں جماعت تک اردو کی تعلیم کا انتظام ہو جائے۔

(4) ہائر سکنڈری کی راہیں خود بخود استوار ہو جائیں گی۔

پھر کیا! اردو کے طلبا اپنی شخصیت کی صحیح خطوط پر تعمیر کرسکیں گے۔

اردو ملک وملت کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی سے کامل ہم آہنگی رکھتی ہے یہ بلاشبہ ملک گیر زبان ہے۔ ہندوستان کی علاقائی زبانیں بھی اپنا اثر ورسوخ رکھتی ہیں مگر اردو کے مقابلے میں ان کا اثر محدود ہے اس لیے ضروری ہے کہ اردو اور علاقائی زبانوں کے رشتے کو مضبوط بنایا جائے۔ اب اردو لکھنؤ اور دہلی کی زبان نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی زبان ہے۔ ایک نئے رنگ میں زندہ ہے جو تمام علاقائی زبانوں اور تہذیبوں کا رنگ ہے۔ اردو کے مستقبل میں ''دھنک'' بن کر ابھر رہا ہے چونکہ اردو ہر رنگ کو اس کے اصلی روپ میں اپنے اندر جذب کرنے کا ہنر رکھتی ہے اور ''ہند پاک'' برصغیر کی حدود کو لانگ کر بین الاقوامی سطح پر اپنے جوہر دکھا رہی ہے۔ وہ جاپان جو کسی زبان کو اپنے ملک میں پسند نہیں کرتا تھا وہاں بھی شعبۂ اردو قائم ہے اور ایک ایسے استاد یہاں آئے جو اردو رسم الخط جانتے اور لکھتے ہیں چونکہ عام بول چال میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ ایک ہے صرف لکھنے کا ''رسم الخط'' جدا ہے۔ ہم نے جسے اردو، ہندی کے دائرے میں بانٹ دیا وہ ''ہندوستانی'' زبان ہے۔ اگر یہ دو نام نہ ہو کر ایک نام ہندوستانی ہوتا بھلے یہ دونوں رسم الخط میں الگ الگ لکھی جاتی تو آج ہم ان نامساعد حالات کا شکار نہ ہوتے بہرحال اب آگے دیکھنا۔ اکیسویں صدی میں وہ سب کچھ کرنا ہے جو اب تک نہیں ہوا اس کو امن کی صدی بنانے کی کوشش کرنا ہے۔ یہی اردو کا پیغام ہے اور انسانیت کا کام............

❑❑❑

**Dr. Rafat Jamal**
Prof. (Ex.)
311, Amborsaria
Apartment Lank
Varanasi-221005 (U.P)

ڈاکٹر محمد جابر حمزہ

# نذر سجاد حیدر

## اور ان کی افسانہ نگاری

نذر سجاد حیدر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون تھیں۔ وہ بہ یک وقت ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر، مدیر، مترجم اور ایک سماجی مصلح کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ نذر سجاد حیدر کی پیدائش 1892 میں علی گڑھ میں ہوئی۔ ان کا اصل نام نذر زہرا بیگم تھا لیکن وہ بنت نذر الباقر اور مس نذر الباقر کے نام سے لکھتی تھیں۔ شادی کے بعد نذر سجاد حیدر کے نام سے لکھتی رہیں۔ والد کا نام میر نذر الباقر تھا اور والدہ کا نام مصطفائی بیگم تھا۔ نذر سجاد حیدر کے والد اور والدہ دونوں کا تعلق اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانوں سے تھا۔ یہ گھرانہ اپنی روشن خیالی اور ادبی مذاق و ماحول کے سبب جانا جاتا تھا۔ نذر سجاد حیدر کو یہی ماحول وراثت میں ملا اور اسی نے ان کے ادبی ذوق کی آبیاری کی۔ جس معاشرے میں عورتوں کی تعلیم کا تصور ہی نہیں تھا اس میں نذر الباقر نے اپنی بیٹی کو اچھی تعلیم دلائی اور اس کے دوسرے تمام شوق کو پورا کیا۔ نذر سجاد حیدر کو فوٹو گرافی، موسیقی اور فیشن ڈیزائننگ کا بڑا شوق تھا۔ نذر الباقر صاحب نے نہ صرف اس کی اجازت دی بلکہ انھیں فوٹو گرافی کے لیے ایک الگ اسٹوڈیو بھی بنوا کے دیا۔ انھیں موسیقی کی تعلیم دینے کے لیے استاد مقرر کیے اور فیشن ڈیزائننگ کا فن بھی سکھایا۔ وہ ایک بہترین ڈیزائنر تھیں اور انھوں نے قسم قسم کے برقعے بھی تیار کیے جو مذہبی ضروریات کو پوری کرنے کے ساتھ ساتھ جدید طرز کے بھی حامل تھے۔ نذر سجاد حیدر کو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا وہ آٹھ سال کی عمر سے ہی اخبارات اور رسائل میں دلچسپی لینے لگی تھیں اور کچھ ہی عرصے میں وہ ان رسائل و اخبار میں شائع ہونے والے مضامین پر اظہار خیال بھی کرنے لگیں۔ یہی وہ وقت تھا جب انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز مضمون نگاری سے کیا اور ان کے مضامین مخزن، نیرنگ خیال، ادیب، تمدن، انقلاب، وکیل، تہذیب نسواں، عصمت، حور اور خاتون جیسے رسائل و جرائد کی زینت بنے۔ وہ ایک بہترین مضمون نگار کی حیثیت سے اردو دنیا میں بہت جلد مشہور و مقبول ہو گئیں، خود انھیں کے مطابق:

> ”اردو اخبار و رسائل آٹھ سال کی عمر سے پڑھنے لگی تھی۔ خصوصاً رسالہ مخزن سے دلی انس تھا۔ میرا پہلا مضمون بھی اس میں چھپا تھا۔ اخبارات میں سب سے زیادہ علی گڑھ گزٹ اور وکیل امرتسر کی قدر داں تھی۔ وکیل نہایت عمدہ قومی اور اصلاحی اخبار تھا۔ معاشرتی اصلاح میں پہلا قدم اسی کے ذریعے اٹھایا گیا تھا۔ میں نے بھی کہنہ، فضول رسومات شادی و غم کے خلاف وکیل ہی میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کے بعد 'تہذیب نسواں' میں مگر وہ زمانہ 04-1903 کا تھا جب میرا شمار کمسن لڑکیوں میں تھا۔“

(مشمولہ، نذر سجاد حیدر یلدرم کی ادبی خدمات، ڈاکٹر وسیمہ سلطانہ، پگڈنڈی، یلدرم نمبر، جلد نمبر 5، 1961، ص 41)

نذر سجاد حیدر ایک باصلاحیت مدیر بھی تھیں۔ شمس العلماء سید ممتاز علی تاج نے بچوں کے لیے ہفت روزہ 'پھول' جاری کیا تو اس کی ادارت نذر سجاد حیدر کے سپرد کی۔ سید ممتاز علی نذر سجاد حیدر کو اپنی حقیقی بہن کی طرح عزیز رکھتے تھے اور ان کے بعد ان کے فرزند امتیاز علی تاج بھی انھیں حقیقی پھوپھی کا درجہ دیتے تھے۔ ان کی اہلیہ حجاب امتیاز علی نذر سجاد حیدر کو خالہ کہہ کر پکارتی تھیں۔ نذر سجاد حیدر نے رسالے کی ادارت بھی کی اور بچوں کے

لیے کہانیاں بھی لکھیں جن میں پھول کا ہار، سلیم کی کہانی، سچی رضیہ اور اس کی بکری جیسی کہانیاں بچوں میں کافی مقبول ہوئیں اور پنجاب کے اسکولوں کے نصاب میں انھیں شامل کیا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے رسالوں کے لیے بھی مضامین لکھا کرتی تھیں۔ اکثر وبیشتر انھیں ان رسائل کے مدیروں کے خطوط ملا کرتے تھے جن میں ان سے کسی نہ کسی مضمون کی فرمائش رہتی تھی۔ شیخ محمد عبداللہ جو رسالہ 'خاتون' کے مدیر تھے 1907 میں انھیں خط لکھ کر ایک مضمون کی فرمائش کرتے ہیں:

''جناب بیگم صاحبہ تسلیم!

اس ماہ کے عرصے میں ہم کو 'خاتون' کے دو تین پرچے تیار کرنے ہیں کیوں کہ ہمارا مقصد ہے کہ 'خاتون' اب وقت پر نکلا کرے۔ اس لیے آپ کے پاس لکھتے ہیں کہ آپ کوئی عمدہ اور بڑا مضمون بھیج کر اس کام میں ہماری امداد فرمائیں۔ آپ کی آنکھوں کا لحاظ کرتے ہوئے یہ تکلیف نازیبا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ اس تکلیف دہی کو آپ معاف فرمائیں گی۔''

(کار جہاں دراز ہے، قرۃ العین حیدر، ص:144۔143)

نذر سجاد حیدر تحریک نسواں کی ایک فعال کارکن تھیں۔ حقوق نسواں خاص طور پر مسلم خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے وہ صرف لکھتی ہی نہیں تھیں بلکہ اس کے لیے عملی اقدام بھی کیا کرتی تھیں۔ انھیں 'آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس' کے چھٹے اجلاس کی وائس پریزیڈنٹ بھی بنایا گیا تھا۔ ان کی صاحبزادی اور انتہائی معروف ناول و افسانہ نگار قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

''اماں کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک آزادیٔ نسواں کی وہ ایک پیش رو ہیں اور سرگرمی سے اس میں حصہ لیا۔ لیکن انھوں نے اسٹیج پر تقریر کبھی نہیں کی۔ البتہ اپنے قلم کے زور سے خوب خوب جد جہد کی۔ آزادیٔ نسواں اور آزادیٔ ہند دونوں کے لیے سرگرم رہیں۔'' (گذشتہ برسوں کی برف، قرۃ العین حیدر، 1990)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ نذر سجاد حیدر صرف آزادیٔ نسواں کے لیے ہی کوشاں نہیں تھیں بلکہ تحریک آزادیٔ ہند کے لیے بھی جدوجہد کر رہی تھیں۔ انھوں نے سودیشی تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بدیسی اشیا کا بائیکاٹ کیا ساتھ ہی کھدر کا بھی استعمال کیا۔ نذر سجاد حیدر کی شادی 1912 میں اردو کے مشہور و معروف ادیب سجاد حیدر یلدرم سے ہوئی۔ سجاد حیدر یلدرم کا شمار اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم سنی تھے اور نذر سجاد حیدر شیعہ تھیں لیکن تمام رکاوٹوں کے باوجود دونوں کی شادی ہوئی۔ نذر سجاد حیدر کا انتقال 19 اکتوبر 1967 کو ممبئی میں ہوا۔

نذر سجاد حیدر نے سات ناول اور سو کے قریب افسانے لکھے۔ ان کے بیشتر ناولوں کو ان کی بیٹی قرۃ العین حیدر نے مرتب کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ان کے ناول کی کلیات ''ہوائے چمن میں خیمۂ گل'' کے نام سے ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی سے 2004 میں شائع کیا جس میں کل سات ناول ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نذر سجاد حیدر نے کم و بیش سو سے زائد افسانے لکھے لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ان کے افسانوں کا نہ کوئی انتخاب، نہ ہی کوئی مجموعہ اور نہ ہی ان کی کلیات شائع ہو سکی۔ البتہ کچھ افسانے جو اس وقت کے رسائل میں بکھرے پڑے ہیں، ہمیں پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ راقم الحروف کو تلاش بسیار کے باوجود ان کے چند افسانے ہی مل سکے جن میں ان کا پہلا افسانہ ''مہذب گھر'' (عصمت، مارچ۔اپریل، 1909)، ''ہائے تم بھی انھیں کی بیوی ہو'' (خاتون، ستمبر، 1910)، ''اسلم کا پہلا روزہ اور عید کی خوشی'' (خاتون، ستمبر، 1911)، ''شائستگی و سلیقہ'' (عصمت، دسمبر، 1913)، ''اختر و زہرا'' (نیرنگ خیال، اگست، 1927)، ''مایوس تمنا'' (نیرنگ خیال، 1928)، ''تین بھاوجیں'' (عصمت، جولائی۔ اگست۔ستمبر، 1939)، ''نجمہ'' (بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب، مرتبہ۔ ترنم ریاض)، ''حسینہ'' (ستمبر۔اکتوبر، 1942)، ''ایام عروسی'' (عصمت، جولائی، 1948)، ''ستمبر 1947 کا بھوت'' (عصمت، اگست، 1949) وغیرہ افسانے ہیں۔ اس کے علاوہ چند افسانے ایسے ہیں جو قسط وار شائع ہونے کی وجہ سے مکمل نہیں مل سکے جن میں مالی کی بیٹی، تقدیر کے پھیر، نیرنگ زمانہ، ہار جیت، حق یا حقدار، خون ارمان، حضرت نصیب شمسہ، جوگن وغیرہ ہیں۔ یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ اب تک نذر سجاد حیدر کے افسانے کے تعلق سے باقاعدہ کوئی مضمون میری نظر سے نہیں گزرا اور جو چند مضامین نظر آئیں بھی ہیں ان میں صرف ان کے تین افسانوں کا ذکر ملتا ہے جن میں نجمہ، مایوس تمنا، اور اختر و زہرا ہے۔ راقم الحرووف نے ان کے جو چند افسانے جمع کیے ہیں وہ زیر ترتیب ہیں۔

نذر سجاد حیدر نے خانگی زندگی کے مختلف مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا افسانہ ''نجمہ'' اور دوسرے افسانوں میں ہمیں خانگی مسائل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ افسانہ ''نجمہ'' میں جمیل کی شادی نجمہ سے نہ ہو کر شکیلہ سے طے ہو جاتی ہے اور اس کا سبب محض خاندانی وقار

اور جھوٹی انا ہے۔ ہمارے معاشرے میں والدین ذہنی طور پر اس کو کبھی قبول نہیں کرتے کہ ان کی اولاد اپنی مرضی سے شریک حیات کا انتخاب کرے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اولاد کی زندگی سے متعلق تمام فیصلوں کا حق انھیں حاصل ہے۔ یہ صورتحال پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور یہی اس افسانے کا موضوع ہے۔ نذر سجاد حیدر کے اس افسانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس رویے کو درست نہیں سمجھتیں کہ اولاد کی مرضی کے خلاف ان کی شادیاں کر دی جائیں لیکن افسانے کے سبھی کردار خواہ وہ شکیلہ ہو یا نجمہ یا پھر جمیل، ان میں سے کوئی بھی اس فیصلے کے خلاف بغاوت نہیں کرتا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے والدین کے اس رویے کو غلط سمجھنے کے باوجود اسے قبول کر لینے کے اس دور کے عام رجحان کی ہی عکاسی کی ہے۔ ان کے کردار اس زیادتی کے خلاف بغاوت نہیں کرتے بلکہ اسے قبول کر کے خود اپنی زندگیاں تباہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح بحیثیت ایک ادیب وہ محض اس وقت کی صورت حال کی عکاسی کرتی ہیں جب کہ بڑا ادیب وہ ہوتا ہے جو عصری صورتحال کی عکاسی بھی کرتا ہے لیکن نئے امکانات اور تجربوں پر نظر بھی رکھتا ہے اور انھیں اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بھی بناتا ہے۔ زیر بحث افسانے میں شکیلہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا شوہر جمیل اس سے نہیں نجمہ سے محبت کرتا ہے، ہر وقت اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور ایک وفادار بیوی کے تمام فرائض ادا کرتی ہے۔ یہ رویہ مثالیت پسندی پر زیادہ اور حقیقت پر کم مبنی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بغیر مرضی کی شادی کے غلط اور خراب نتائج کی عکاسی اس افسانے میں کی گئی ہے لیکن کسی نئے رویے اور رجحان کی آہٹ اور کسی معاشرتی یا سماجی تبدیلی کی جھلک ہمیں اس افسانے میں نظر نہیں آتی۔ شاید یہ دور ہی ایسا تھا کہ بہت سی سماجی قدریں تخلیق کار کے قلم کو روکتی تھیں، پھر جبکہ یہ تخلیق کار ایک عورت ہو۔ اس افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس کی محبت کا نجمہ پر خاص اثر ہوا اور وہ شکیلہ سے لپٹ گئی اور کہا 'پیاری شکیلہ خدا تمھیں یہ شادی مبارک کرے اور تا زندگی شاد کام رہو یہ میری دلی خواہش ہے۔۔۔' اس وقت شکیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے جھک کر اپنا سر نجمہ کے سینے سے لگا دیا اور روتے ہوئے کہا پیاری بہن آپ دعا کریں کہ میری آئندہ زندگی اپنے شوہر کی رضامندی میں بسر ہو۔ میں ہمیشہ آپ کو اپنی حقیقی بہن سمجھوں گی۔''

(نجمہ، بیسویں صدی میں خواتین کا ادب۔ مرتبہ۔ ترنم ریاض، ساہتیہ اکادمی 2004، ص۔68)

افسانہ نگار کا یہی محتاط رویہ ہمیں ایک دوسرے افسانے ''مایوس تمنا'' میں بھی نظر آتا ہے۔ یہاں بھی مسئلہ محبت میں ناکامی کا ہے۔ نام نہاد معاشرتی قدریں یہاں بھی محبت کی راہ میں آ جاتی ہیں۔ افسانے کی ہیروئین اپنی محبت کو عملی شکل دینے سے قاصر ہے کیوں کہ اسے سماجی روایات کے خلاف بغاوت کرنی پڑتی جس کی اس میں ہمت نہیں۔ اس طرح یہ افسانہ بھی صورتحال کی عکاسی تو کرتا ہے لیکن نئے امکانات کی تلاش اس میں بھی نظر نہیں آتی۔ بغاوت کی کوئی چنگاری یہاں بھی شعلہ نہیں بنتی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ افسانہ بھی ایک حقیقی تصور حیات کی جگہ ایک رومانی تصور حیات رکھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ نذر سجاد حیدر نے بہت سی معاشرتی برائیوں کی عکاسی اپنے افسانوں میں کی ہے اور یہ عکاسی فطری بھی ہے اور حقیقی بھی لیکن صورتحال میں کسی تبدیلی کا امکان ہمیں نظر نہیں آتا۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ نذر سجاد حیدر نے سماجی مسائل میں جس مسئلے پر زیادہ قلم اٹھایا وہ رومان و محبت اور اس میں ناکامی کا مسئلہ تھا جس کا انجام عام طور پر بے میل اور بغیر مرضی کی شادی ہوا کرتا تھا۔ اس موضوع کی اپنی حدود تھیں اور یہ مسئلہ عام سماجی مسئلے سے زیادہ ایک اخلاقی مسئلہ تھا اور بحیثیت ایک خاتون افسانہ نگار کے شاید انھوں نے یہ مناسب نہ سمجھا ہو کہ وہ افسانے کو اس طرف لے جائیں جہاں ان پر بداخلاقی کی تبلیغ کا الزام عائد کیا جائے:

> ''........ غریبی، فقیری دیکھ لی، اب کوئی ایسی بات نہ کروں گی جو حد شرافت سے باہر ہو ورنہ میرے دل میں بھی آپ کی قدردانی کے جذبات حد سے سوا ہیں۔ اور شاید میری زندگی کا کوئی خوش کن خیال ہے تو وہ آپ کا خیال، مگر بس خیال تصور اور کچھ نہیں۔''

(مایوس تمنا، سالنامہ، نیرنگ خیال 1928ص۔178)

نذر سجاد حیدر کا ایک اور بے حد تاثراتی افسانہ ''حسینہ'' بھی ایک اور اہم سماجی مسئلے کی عکاسی کرتا ہے اور وہ مسئلہ ہے اولاد کی شادی کو ایک کاروبار کی حیثیت دے دینا۔ احسان احمد کے والد پہلے اس کی شادی غریب منیہ کی بیٹی حسینہ سے کرتے ہیں، نکاح ہو جاتا ہے لیکن رخصتی موخر کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد دولت کے لالچ میں ایک امیر لڑکی سے احسان کی شادی کر دی جاتی ہے، جس کے نتیجے میں احسان اور حسینہ کی زندگی تاریک ہو جاتی ہے۔ احسان ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر ہو جاتا ہے اور ایک مدت بعد حسینہ اس کے بیٹے کی انا کے طور پر صادقہ کی شکل میں ملازم ہو جاتی ہے اور ایک دن یہ راز احسان پر فاش ہو جاتا ہے اور بیمار صادقہ احسان اسی

میں دم توڑ دیتی ہے:

''حسینہ تم صادق الاقرار نکلیں مجھ پر قربان ہوگئی۔ آہ! میں گناہ گار جفا کار خدا مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ صادقہ آنکھیں کھولو، پہلے کی طرح ایک بار اور آنکھیں کھول دو۔ کبھی اس کی طرف جھکتے اور اپنے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے، کبھی دل کی حرکت دیکھتے، اسی اثنا میں ڈاکٹر آ گیا اور اس نے ڈپٹی صاحب کو یقین دلایا کی یہ آنکھیں اب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی ہیں۔''

(حسینہ، عصمت، دہلی۔ اکتوبر1942، ص۔255)

یہ افسانہ ایک المناک انجام پر ختم ہوتا ہے، نذر سجاد حیدر نے احسان احمد کی شکل میں ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جو حسینہ سے بے انتہا محبت کرتا ہے لیکن اپنے والدین سے بغاوت نہیں کرتا اور چپ چاپ ان کی مرضی سے دوسری شادی کر لیتا ہے۔ حسینہ کے مرنے کے بعد جب اسے حسینہ کے والد کا خط ملتا ہے تب بھی افسانہ نگار نے یہ نہیں بتایا کہ وہ اپنے والد کے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرے۔ اس طرح یہ ایک بے عمل کردار ہے۔ دراصل اس دور کے زیادہ تر افسانوں میں بالخصوص خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں ابتر صورت حال کی عکاسی تو نظر آتی ہے لیکن ان کے کردار اس صورت حال کے خلاف بہت کم بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔

افسانہ ''ایامِ عروسی'' افسانہ بشکل خط ہے۔ سوشیلا اور اندرا نام کی دو سہیلیاں ایک دوسرے کو خط لکھتی ہیں اندرا اپنی شادی، شوہر اور ہنی مون سے متعلق تمام تر تفصیلات سے سوشیلا کو آگاہ کرتی ہے۔ اپنی کئی اور سہیلیوں کا بھی ذکر کرتی ہے جن میں ذکیہ نام کی لڑکی کا ذکر بطور خاص کیا جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے بے حد خوبصورتی سے اس مخلوط معاشرت اور گنگا جمنی تہذیب کی مرقع سازی کی ہے جو برصغیر کی شناخت رہی ہے۔ ''تمھارے جیجا'' کی جگہ ''تمھارے دولہا بھائی'' کا استعمال یہ ظاہر کر رہا ہے کہ ہندوستان کے ایک بڑے حصے خصوصاً شمالی ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرز معاشرت کم و بیش ایک جیسی ہی تھی:

''میرے کمرے میں ذکیہ بیٹھی تھی اس نے اٹھ کر چک میں سے خود دیکھا اور مجھ کو بھی دکھایا۔ بہت شریف و وجیہہ و جاذب نظر معلوم ہوئے۔ لباس بھی لکھ دوں اس وقت وہ بادامی چائنا سلک کا سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہاں آنکھیں کمزور معلوم ہوتی ہیں۔ چشمہ لگا تھا۔ شام کا وقت تھا برقی روشنی میں سنہری کمانیاں چمک چمک کر چہرے کی رونق بڑھا رہی تھی۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری چھوٹی بہن سے باتیں کر رہے تھے۔ تم بہت یاد آئی اگر ہوتی تو اپنی پیاری اندرا کی زندگی کے مالک سے ملاقات کرکے بہت خوش ہوتیں۔ ذکیہ پردہ دار لڑکی ہے مل نہیں سکی۔''

(ایامِ عروسی، عصمت، کراچی، جولائی1948 ص۔42)

''ستمبر 1947 کے بھوت'' نذر سجاد حیدر کے ایک اور افسانے ''حور صحرائی'' کی یاد دلا دیتا ہے۔ یہاں بھی ایک ایسی کوٹھی کرائے پر لینے والا جو بھوتوں کے مسکن کے طور پر مشہور تھی، عجیب و غریب حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ پروین نام کی لڑکی کو اس کے چچا اور چچی نیز منگیتر کا قتل کرکے اس کا ایک دوسرا چچازاد بھائی قید کر لیتا ہے۔ کوٹھی کرائے پر لینے والا نوجوان اس تک پہنچ جاتا ہے۔ لڑکی اسے اپنی کہانی سناتی ہے اور وہ اس کی مدد کرنے کا وعدہ کرتا ہے لیکن لڑکی رات کو پھر غائب ہو جاتی ہے اور پھر اس کی لاش اسی بھوت والی کوٹھی میں ملتی ہے۔ افسانہ یہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔ افسانے کی فضا بے حد پراسرار سی لگتی ہے اور اسے پڑھ کر حجاب اسمٰعیل کے افسانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

''اسی کوٹھی میں جو پرویز کی ہے اور ہم دونوں کے لیے بنائی گئی تھی اس میں میرا شوہر ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے۔ میں اس کی دائمی آرام گاہ بھی دیکھ چکی ہوں۔ ایک دن وہ قاتل بھائی بھولے سے مجھ کو بغیر باندھے چلا گیا تھا تو میں نے تمام تمام کوٹھی میں پرویز کی قبر تلاش کی وہ ایک تہ خانہ میں دفن ہے۔ کچی مٹی کا ڈھیر سا ہے جس پر لکڑیاں، پرانے تختے اور ٹوٹے گھڑے مٹکے ڈال دئے گئے ہیں۔ بس میں بھی وہیں سونا چاہتی ہوں۔''

(ستمبر1947 کا بھوت، عصمت، کراچی، اگست1949 ص۔93)

نذر سجاد حیدر کے زیادہ تر کردار مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسا شاید اس لیے ہے کہ وہ خود بھی ایسے ہی طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ افسانہ ''مہذب گھر'' ایسے ہی ایک خاندان کی کہانی ہے جو طرز معاشرت اور رہن سہن کے اعتبار سے مغربی طرز زندگی کا حامل ہے۔ بچے کی سال گرہ کے موقع پر لیڈیاں بلائی جاتی ہیں اور ان کے سامنے بچوں کے ذریعے اسپتال کے غریب بچوں کے لیے کمبل خریدنے کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سال گرہ کے موقع پر انجام دی جانے والی بہت سی رسموں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی بات بھی کہی جاتی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اصلاح معاشرہ کی تحریکات نے اس دور میں

اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا اور لوگ خاص طور پر تعلیم یافتہ گھرانے غیر ضروری رسموں سے اجتناب کرنے لگے تھے:

''سالگرہ کی رسم یعنی گھاس کی پتی اور کلاوہ میں گانٹھ دیں جس میں کوڑی اور لوہے کا چھلا بندھا ہو بالکل فضول ہے۔ ان ہی رسوم کے باعث ہم ذلیل ہو رہے ہیں۔ میں نے اپنے بچوں کی عمر کا حساب رکھنے کی ایک کتاب بنالی ہے، جس کی سنہری جلد بندھ وائی ہے۔ اول ورقوں میں قرآن مجید کی آیات ہیں۔ اس پر سال کے سال عمر کا حساب لکھ دیتی ہوں۔ یہ کہہ کر کتاب میز پر سے اٹھا خورشید نے سال مہینہ وغیرہ لکھدیا۔ پھر سب بیبیوں نے ہاتھوں ہاتھ کتاب دیکھی۔''

(مہذب گھر، عصمت، دہلی، اپریل 1909ص-20)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نذر سجاد حیدر کی افسانہ نگاری کا اصل مقصد معاشرے کی اصلاح اور غلط رسوم کا خاتمہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ عام طور پر اپنے ہر افسانے میں یا تو کسی سماجی مسئلے کی عکاسی کرتی ہیں یا پھر اصلاح معاشرہ کی مختلف صورتوں کو پیش کرتی ہیں۔ افسانہ ''شائستگی وسلیقہ'' دو خواتین کی باہمی گفتگو پر مشتمل ہے جو کم خرچ بالانشیں کے اصولوں کے مطابق گھر گرہستی چلانے کے بارے میں ہے۔ اس افسانے میں بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں کھاتے پیتے مسلم گھرانوں کی طرز معاشرت کی بخوبی عکاسی کی گئی ہے۔

تعدد ازدواج کے مسئلے پر لکھا گیا افسانہ ''ہائیں تم بھی انھیں کی بیوی ہو'' متاثر کرتا ہے۔ دو عورتیں ریل میں سوار ہوتی ہیں، ایک اپنی سسرال جارہی ہے اور دوسری اپنے شوہر کے پاس۔ افسانہ نگار نے دونوں کا حلیہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''پہلی مسافر بی بی سفید خاصے کا ہندوستانی بڑا غرارہ اور مخمل کا پیازی رنگا ہوا کرتی دو پٹہ پہنے تھیں۔ اور زیور بھی ویسا ہی ہاتھوں میں سونے کے دو دو بٹانے اور پیچھے ہندوستانی چوڑیاں گلے میں چمپا کلی اور کانوں میں بجلیاں پڑی تھیں۔ ناک میں ایک طرف لکھنؤ کی چھوٹی سی کیل۔ منہ میں پان اور مسی بھی۔ پیروں میں دہلی کی سلیم شاہی جوتی تھی۔ اور دوسری امرتسر سے سوار ہونے والی بی بی سبز کناویز کی شلوار اور گلابی ریشمی پھولدار قمیص۔ آسمانی مخمل کی واسکٹ پہنے اور بادامی پھولدار کریب کا دوپٹہ اوڑھے تھیں۔ ہاتھوں میں سونے کے کڑے اور کانوں میں جڑاؤ در تھے۔ اور پاؤں میں کابلی جوتی تھی۔''

(ہائیں تم بھی انھیں کی بیوی ہو، خاتون 1911ص-382)

دونوں میں گفتگو شروع ہوتی ہے اور جب ٹرین منزل پر پہنچتی ہے تو یہ بھید کھلتا ہے کہ دونوں ایک ہی شخص کی بیویاں تھیں۔ افسانہ بے حد اچھا ہے اور اس میں فنی تقاضوں کا خیال رکھا گیا ہے لیکن آخر میں چند جملے محض ایک تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں جو غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل اس دور میں اصلاح معاشرہ ہی تخلیقی ادب کا مقصد تھی اس لئے عام طور پر ناصحانہ اسلوب ہی افسانہ وشاعری پر حاوی رہتا تھا۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ افسانہ نگار نے سہارنپور سے تعلق رکھنے والی بی بی کو ہندوستانی کہا ہے جبکہ دوسری عورت کو وہ پنجابی لکھتی ہیں گویا اس وقت پیشاور و پنجاب کو ہندوستان کا حصہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ یہاں ہندوستانی بی بی سے مراد اردو بولنے والی خاتون ہے یعنی وہ عورت جو ہندوستانی بولتی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نذر سجاد حیدر بھی عام بول چال کی اس زبان کو جو شمالی ہند کے بیشتر علاقوں میں بولی جاتی تھی، ہندوستانی قرار دیتی ہیں۔

نذر سجاد حیدر کے بیشتر افسانوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ فضاسازی میں فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیتی ہیں۔ لباس، طرز رہائش، دعوت و تواضع اور مقام واحوال کے بیان میں وہ خاصے سلیقے سے کام لیتی ہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانوں کا پس منظر اعلیٰ طبقے کی معاشرت ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے مسلم معاشرے کی بے حد حقیقی اور فطری تصویریں ان کے افسانوں میں نظر آتی ہیں۔ نذر سجاد حیدر ایک بڑی افسانہ نگار نہ سہی لیکن اس دور کی خواتین افسانہ نگاروں میں ان کا ایک اہم مقام ہے۔ وہ عصری سماجی صورتحال کی نبض شناس ضرور ہیں لیکن ان کے افسانوں میں عام سماجی رویے اور معاشرتی ڈھانچے سے انحراف اور بغاوت کا رویہ نہیں ملتا ہے۔ ہاں وہ ایک عمدہ تخلیقی زبان اور موثر اسلوب اظہار کی بنا پر قاری کے ذہن ودل کو اپنی گرفت میں ضرور لے لیتی ہیں۔

□□□

**Dr. Mohd Jabir Hamza**
Dept. of Urdu, MANUU
Gachibowli
Hyderabad-500032 (Telangana)
Mobile- 9198329043
mohdjabir786@gmail.com

# معاشی تفریق اور صحتمند معاشرہ

معصوم زہرا

انسانی تہذیب کا معاشی نابرابری سے بہت گہرا اور پرانا رشتہ رہا ہے۔ گرچہ اس کو سماجی طور پر معیوب سمجھا گیا ہے اور اس کو دور کرنے کی باتیں بھی ہر زمانے میں ہوتی رہی ہیں لیکن آج بھی کوئی بہتری نہیں آئی ہے۔ طبقاتی جدوجہد جیسے تصور کے عروج کے پیچھے معاشی نابرابری ایک بڑی وجہ ہے۔ وقتاً فوقتاً اس مسئلے پر تنازعات بھی ہوتے رہے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے دنیا میں جمہوری نظام کا ارتقا ہوا، اس سے یہ امید پیدا ہوئی کہ عدم مساوات پر مبنی نظام میں بہتری آئے گی۔ اعلانیہ طور پر جمہوری نظام میں معاشرتی تفریق کو دور کرنا بنیادی ہدف بتایا جاتا ہے لیکن معاشی مساوات کے حصول کے بغیر سماجی مساوات کی بات بے معنی ہوگی۔ سماج میں چوطرفہ پھیل رہی تفریق کے لیے سب سے زیادہ ذمہ دار معاشی نابرابری ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان مخلوط معیشت کی راہ پر گامزن ہوا۔ 80 کی دہائی میں ہندوستانی معیشت میں تبدیلی کا آغاز کیا۔

سماجی نابرابری ہی ملک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے ہمیں اسے ختم کرنا ہوگا۔ سماجی، معاشی، تعلیمی، علاقائی اور صنعتی تفریق ملک کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ معاشرتی عدم مساوات کی وجہ سے آج معاشرے میں باہمی محبت، اخوت، انسانیت اور اخلاقیات دم توڑ رہی ہیں۔ معاشرے کو ذاتی مفاد کے لیے ذات پات اور مذہب کے درمیان تقسیم کرنا مناسب نہیں ہے۔

معاشی تفریق کے سبب معاشرے میں سرمایہ داروں کی تعداد میں تو تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، لیکن سماج کا غریب طبقہ آج بھی اسی جگہ پر کھڑا ہے، یا وہ مزید غریب ہوتا جا رہا ہے۔ معاشی انصاف ہی سماجی انصاف کی بنیاد ہے۔ معاشی انصاف کے بغیر ہم سماجی انصاف کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اگر ہم واقعی سماجی انصاف کے حامی ہیں تو ہمیں معاشی انصاف کو مضبوط بنانا ہوگا۔ اس کے لیے سنجیدگی سے اہداف طے کر کے عملی جامہ پہنانا ہوگا۔

تعلیمی تفریق کی وجہ سے ہم معاشرے کے پسماندہ طبقات کو اچھی تعلیم فراہم کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تعلیم کے بغیر کوئی بھی شخص، معاشرہ یا قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ لہٰذا تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو ہمیں غور و فکر، فرض اور حقوق کا احساس کرائے، ہمیں حقوق دلائے اور سماج اور ملک کے لیے ہمیں ذمہ دار بنائے۔ کیا ہم معاشرے کے تمام طبقات کو ایسی تعلیم دینے میں کامیاب ثابت ہو رہے ہیں؟

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ معاشی نابرابری کی وجہ سے، ریاست اور سماج میں کئی طرح کے عدم مساوات اور سماجی نابرابری کی صورتحال پیدا ہوتی ہے۔ جس کے بہت منفی اور کبھی کبھی تو بہت سنگین نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ معاشی نابرابری کے سبب سماج میں طرز زندگی، تعلیم، صحت، رہائش کے علاوہ بہت سے بنیادی محاذ پر عدم مساوات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ان محاذ پر عدم مساوات میں اضافہ سے، فطری طور پر سماجی توازن غارت ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے خدمات و نظام کا بچ پانا اور

برقرار رہنا ممکن نہیں ہے۔

تیزی سے بڑھتے ہوئے معاشی عدم مساوات پر قابو پانے کے لیے، حکومت یہ تاثر دیتی ہے کہ اگر معیشت ترقی کر رہی ہے تو اس کے فوائد نچلے طبقے کے لوگوں تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ نوبل انعام یافتہ امریکی ماہر معاشیات جوزف اسٹگلٹس نے اپنی کتاب 'میکنگ گلوبلائزیشن ورک' میں لکھا ہے کہ معاشی ترقی کے فوائد سماج کے نچلے طبقے تک رِس کر پہنچتے ہیں۔ قابل غور پہلو ہے کہ یہ کتابی نظریہ زمینی حقیقت سے بالکل مختلف ہے۔ ایسی سوچ رکھنے والوں کو چین سے سبق لینا چاہیے۔ 2001-2003 کے دوران چین کی معاشی ترقی کی شرح دنیا میں سب سے زیادہ تھی۔ ان برسوں میں چین نے سالانہ 10 فیصد کی شرح سے معاشی ترقی حاصل کی۔ یہاں دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اس عرصے کے دوران، چین میں معاشی طور پر نچلی سطح پر رہنے والے دس فیصد لوگوں کی آمدنی میں ڈھائی فیصد کمی واقع ہوئی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ معاشی ترقی کی تیز رفتار سے عام لوگوں کی حالت میں مثبت تبدیلیاں لانے کے دعوے کتنے کھوکھلے ہیں۔

نیشنل سیمپل سروے کی رپورٹ کے مطابق آج بھی ہندوستان میں 20 کروڑ سے زائد افراد 12 روپے یومیہ کی شرح سے اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ریاستوں کے اعتبار سے، اڑیسہ اور چھتیس گڑھ میں، 55 سے 57 فیصد دیہی افراد گھر چلانے کے لیے صرف 12 روپیہ خرچ کر پاتے ہیں۔ مدھیہ پردیش کے 47 فیصد افراد انھیں حالات کا سامنا کر رہے ہیں۔ گاؤں میں رہنے والے دس فیصد لوگ تو ایسے بھی ہیں، جو روزانہ صرف 9 روپے ہی خرچ کر پاتے ہیں۔ کچھ برس پہلے کی گئی ایک تحقیق کے مطابق، جھارکھنڈ اور راجستھان کے قبائلی علاقوں میں رہنے والے 99.8 فیصد خاندانوں کو پورے سال میں مہینے بھر میں دو وقت کی روٹی بھی نہیں مل پا رہی ہے۔ ان میں سے 76.6 فیصد خاندان ایسے تھے، جنھوں نے مہینوں سے کسی بھی قسم کی دال یا دودھ کا استعمال نہیں کیا تھا۔

آج دنیا کی ہر لگژری کار کی مانگ ہندوستان میں تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ملک میں ایک لاکھ افراد ایسے ہیں جن کے پاس 70 لاکھ یا اس سے زائد قیمت کی ایک یا زیادہ موٹر گاڑیاں ہیں۔ ملک میں 70 لاکھ سے زائد افراد ایسے ہیں، جن کے ہاتھوں میں ڈھائی لاکھ سے 25 لاکھ تک کی گھڑیاں بندھی ہوئی ہیں۔ قریب دس لاکھ افراد ایسے ہیں جو ہر سال پانچ لاکھ مالیت کے زیورات خریدتے ہیں۔ ان حقائق سے ملک میں رائج معاشی عدم مساوات کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ دراصل 'ہندوستان' اور 'انڈیا' کے درمیان استعمال اور کھپت کا بہت بڑا فرق ہے۔ ہندوستان کے پاس جہاں ضروری اشیا کی بڑی کمی ہے۔ وہیں 'انڈیا' کی طرز زندگی کا پیمانہ ہی پر تعیش زندگی ہے۔ ایک طرف لوگ بھوک سے مر رہے ہیں، وہیں دوسری طرف موٹاپا سے نجات حاصل کرنے کے لیے امیر طبقہ مزے مزے میں لاکھوں روپے خرچ کر رہا ہے۔

معاشی تبدیلیوں کا فائدہ ملک کے سرمایہ داروں تک ہی محدود رہ گیا ہے۔ اس طبقے کی آمدنی میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 1999-2000 کے مقابلے میں ملک کے امیر طبقے کے اخراجات میں 60 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ عدم مساوات کی خلیج اتنی گہری ہو گئی ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس میٹروپولیٹن شہروں میں کئی کئی بنگلے ہیں۔ جبکہ دوسری جانب ایسے بے شمار لوگ موجود ہیں جو ہر موسم میں کھلے آسمان کے نیچے سونے کو مجبور ہیں جن کے پاس سر ڈھکنے کے لیے چھت بھی نہیں ہے۔

ملک میں ایسے بدقسمت لوگ بھی ہیں جن کے پاس علاج کروانے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے ہر سال ہزاروں افراد موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ یو این ڈی پی کے مطابق ملک کے ہر ایک لاکھ میں سے 199 افراد، اب بھی ٹی بی کی وجہ سے مرتے ہیں۔ ضروری طبی سہولیات کا فقدان ان کی موت کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہے۔ صحت مند سہولیات کے حوالے سے ہندوستان کے شہری اور دیہی علاقوں میں بھی ایک بہت بڑا فرق ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق شہری آبادی پر ایک لاکھ آبادی پر 4.48 اسپتال، 6.16 ڈسپنسری اور 308 بستر ہیں۔ جبکہ ایک لاکھ دیہی افراد پر 0.77 اسپتال، 1.37 ڈسپنسری، 3.2 عوامی طبی مرکز اور صرف 44 بستر ہیں۔ تاہم ان اعداد و شمار سے ایک چیز واضح ہے کہ شہروں کی طبی سہولیات کی حالت بھی بہت اچھی نہیں ہے۔ لیکن گاؤں کی حالت بد سے بدتر ہے۔ ایسی صورت میں اس جانب خصوصی توجہ درکار ہے۔ ضرورت ہے کہ سماج میں طبی سہولیات کی فراہمی میں جو تفریق کی کیفیت ہے، اس کو دور کیا جائے۔ اب جبکہ پوری دنیا ایک عجیب وبائی مرض کورونا کی زد میں ہے۔ جس کے سبب لاکھوں کی تعداد لقمۂ اجل بن چکی ہے۔ ایسے میں صحت عامہ کی سہولیات اور خدمات کا فائدہ سماج کے ہر طبقہ کو یکساں طور پر فراہم ہو۔ اس کے لیے تیز رفتاری سے عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ وطن عزیز میں کورونا نے جس قدر اپنی گرفت مضبوط کی ہے، اس سے ملک کی طبی سہولیات کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

آج پوری دنیا سماجی نابرابری کی لپیٹ میں ہے۔ ترقی یافتہ ممالک سے لے کر ترقی پذیر ممالک تک عدم مساوات نے ایک خوفناک شکل اختیار کر لی ہے۔ دنیا کے ایک چوتھائی افراد کی آمدنی یومیہ ایک ڈالر سے بھی کم

ہے۔ دنیا کی نصف آبادی کی یومیہ آمدنی ایک ڈالر سے دو ڈالر کے درمیان ہے۔ وہیں دوسری طرف دنیا کے امیر ترین 225 میں سے ایک کی اوسطاً دولت ایک سے تین کھرب ڈالر ہے۔ دنیا بھر میں ہر سال تعلیم، پینے کے پانی، صحت اور تغذیہ پر 28 ارب ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ جبکہ مغربی یورپ اور امریکہ میں ہر سال کاسمیٹکس، آئس کریم اور پالتو جانوروں کے کھانے پر 35 ارب ڈالر خرچ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عدم مساوات کی آگ میں جلنے والی دنیا میں بنیادی سہولیات کی فراہمی کے بجائے مفت استعمال پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق دنیا کے بیس فیصد لوگ دستیاب سامان اور خدمات کا 86 فیصد استعمال کر رہے ہیں۔ امریکہ کے پانچ فیصد دولت مند افراد ملک کی ساٹھ فیصد دولت کے مالک ہیں۔ 1960 میں، دنیا کے 20 امیر ترین اور غریب ترین 20 ممالک کی آمدنی میں 18 فیصدی فرق تھا۔ 1995 میں، یہ فرق 35 فیصدی بڑھ گیا اور اب اس میں مزید اضافہ ہو چکا ہے۔

پچھلے دس سال پوری دنیا کے معاشی منظرنامے میں ایک تبدیلی لانے والے ثابت ہوئے ہیں۔ گزشتہ برسوں کے دوران ہر ملک کی معاشی پالیسیوں میں بہت زیادہ تبدیلی آئی ہے۔ چین کی معیشت بھی بہت تبدیل ہوئی ہے۔ چین کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ان دس سالوں میں، وہاں سب سے کم دس فیصد لوگوں کی آمدنی میں 42 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ جبکہ اس عرصے کے دوران سب سے اوپر دس فیصد کی آمدنی میں 168 فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔

درحقیقت معاشی عدم مساوات کے بیج، مواقع کے عدم مساوات میں پوشیدہ ہیں۔ جن کے پاس اچھے مواقع ہیں، انھوں نے تیز رفتار ترقی کی ہے اور ان کی آمدنی میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ گاؤں اور شہروں کے مابین بڑھتے ہوئے فرق کے لیے مواقع میں نابرابری کی کیفیت بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔

94-1993 میں دیہی ہندوستان کے اعلیٰ دس فیصد کی اوسط سالانہ آمدنی 61,655 روپے تھی۔ جبکہ شہریوں کی اعلیٰ دس فیصد کی اوسط سالانہ آمدنی 1,37,256 روپے تھی۔ اس وقت گاؤں کے سب سے اوپر دس فیصد لوگوں کی اوسط سالانہ آمدنی 1,94,044 روپے ہے جبکہ شہروں کے اعلی دس فیصد لوگوں کی اوسط سالانہ آمدنی 4,97,583 روپے ہے۔

94-1993 میں گاؤں کے نچلے طبقے کے دس فیصد لوگوں کی اوسط سالانہ آمدنی 2,807 روپے تھی، جبکہ ایسے شہری لوگوں کی آمدنی 4,747 روپے تھی۔ ابھی دیہی طبقہ کی اوسط سالانہ آمدنی 8,907 روپے ہے اور شہری طبقہ کی 16,292 روپے ہے۔ ہندوستان میں تنخواہ پانے والے اعلی 20 فیصد کا قبضہ 56 فیصد ہے۔ جبکہ 20 فیصد افراد کو صرف 3.6 فیصد تنخواہ ملتی ہے۔ یعنی صرف 20 فیصد افراد کو نصف سے کم تنخواہ مل رہی ہے۔

اگر نابرابری اسی تیزی سے بڑھتی رہی تو، اس سے پیدا ہونے والے غیر توازن سے نمٹنا بہت مشکل ہوگا۔ بے یقینی اور مایوسی جھیل رہے لوگوں کے ہیجانی اور پرتشدد ہونے کے امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بروقت معاشی نابرابری پر لگام لگانے کے لیے ضروری اقدامات کرنے ہوں گے۔

□□□

**Masum Zehra**
Centre for Social Medicine &
Community Health
JNU
New Delhi-110007

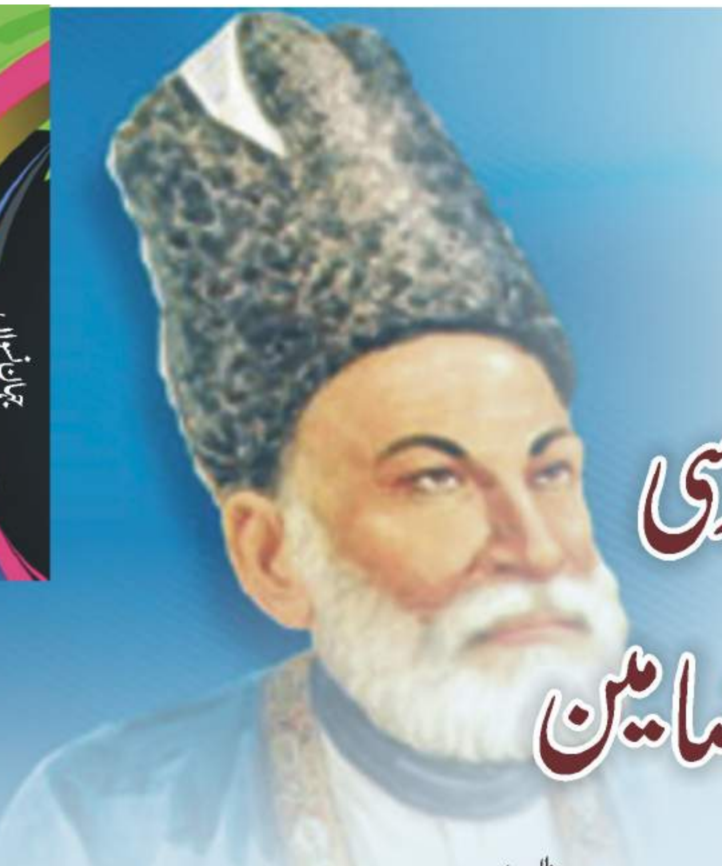

منیرہ نژاد شیخ

# غالب کے اردو فارسی کلام میں عشقیہ مضامین

"بہ عشق از دو جہان بی نیاز باید بود" (غالب، ص 71)

مرزا غالب کا اردو دیوان اس باغِ گل کی طرح ہے جو رنگ بہ رنگ پھولوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں غم و درد کا رنگ نظر آتا ہے مگر اسے درد کی شاعری نہیں کہہ سکتے۔ تصوف کا رنگ اس میں موجود ہے مگر صوفیانہ شاعری پہ پورا نہیں اترتا ہے۔ اس میں شکوہ شکایتیں ہیں مگر اسے شکوہ شکایات پر مشتمل شاعری کہنا بھی درست نہ ہوگا۔ شوخی و طنز کا رنگ اس میں نمایاں ہے مگر اسے طنزیہ شاعری کہنا صحیح نہیں۔ بے شک عشق کا رنگ بھی اس دیوان میں موجود ہے اور یہ رنگ اتنا گہرا ہے کہ دوسرے موضوعات کے اندر بھی کہیں نہ کہیں اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ جہاں غم ہے تو یہ غم، عشق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ جہاں نالہ و شکوہ ہے اس میں بھی عشق مضمر اور پوشیدہ ہے۔ جہاں تصوف ہے تو اس کا محور بھی عشق ہے۔ اخلاقی اشعار کا ہلکا رنگ بھی عشق کی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔ اس مقالہ میں مرزا غالب کے اردو فارسی شاعری کے عشقیہ پہلو کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

**غالب اور عشق:**

مرزا غالب کے کلام میں عشق سب سے اہم موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے اردو فارسی کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے اکثر و بیشتر اشعار، عشق کے دائرے میں آتے ہیں۔ انھوں نے خود ایک فارسی شعر میں اس بات کی طرف صاف اشارہ کیا ہے کہ ان کے اشعار عشق و محبت کا نغمہ ہیں اور جو بھی ان کے قلم سے صفحہ قرطاس پر نمودار ہوا ہے آہ و فغانِ عشق کے علاوہ کچھ اور نہیں:

ہر مطلعی کہ ریزداز خامہ ام فغانیست
جز نغمہ محبت سازم نوا ندارد (ص 79)

مرزا غالب عاشق مزاج آدمی تھے، جس کی وجہ سے وہ عشق میں گرفتار رہنے کو آزادی پر ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے ایک شعر میں خود کو اس پرندے کی مانند قرار دیا ہے جو اڑنے کی طاقت رکھنے کے باوجود عشق کے پنجرے میں قیدی رہنا پسند کرتا ہے کیونکہ ان کی طبعی میلان عشق و محبت سے ہی مانوس تھا۔ اسی انس و الفت کی وجہ سے وہ اپنے اشعار میں بار بار بندِ عشق سے آزاد ہونے کے باوجود بھی اس کے قید و بند میں رہنے کی تمنا کرتے تھے:

ہوں گرفتار الفت عشق
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز (ص 121)

سو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا (ص 59)

مختلف شعرا اور عرفا نے اپنے کلام میں عشق کی توضیح و تعریف کی ہے۔ ان میں اختلافات بھی ہیں اور اتفاق نظر بھی۔ مرزا غالب نے بھی اپنے اشعار میں عشق کی وضاحت کرنے یا اس کا کوئی قابل قبول مطلب بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک شعر کے تحت انھوں نے عشق کو ایک طرح کا دماغی خلل کہا ہے جس سے مراد دماغی صدمہ ہے۔ اس اعتبار سے عاشق وہ شخص ہے جس کا دماغ صدمے کی وجہ سے صحیح سے کام نہیں کرتا۔ مگر غالب کی اس تعبیر میں ایک گہرائی پائی جاتی ہے۔ بے شک مرزا غالب کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ عشق کو دماغی صدمہ اور تباہی کا نام دیں بلکہ وہ عشق میں

عقل و دل کے تضادات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے تھے۔ عشق، محبت کا وہ مرحلہ ہے جہاں عاشق شدت سے کسی چیز کا شیفتہ و مجنوں ہوجاتا ہے۔ جب عشق، عاشق پر حاوی ہوجائے تو وہ اپنے سود و زیاں کو پوری طرح نظرانداز کرتا ہے۔ عاشق اپنی عقل کی بات نہیں سنتا بلکہ دل کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وہی کرتا ہے جو اس کا دل کہتا ہے۔ اس وجہ سے غالب نے عشق کے لیے دماغی خلل کی تعبیر کا استعمال کیا ہے۔

بلبل کے کار و بار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا (ص59)

ایک شعر میں عشق کی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے غالب نے اسے اس آگ سے تشبیہ دی ہے جو بے اختیار انسان کے دل میں فروزاں ہوجاتی ہے اور اس کے بھڑکے ہوئے شعلوں کو خاموش کرنا انسان کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اس شعر سے ایک اہم بات نکلتی ہے کہ عشق کا جذبہ ناخودآگاہ عاشق کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور کوئی آدمی سوچ سمجھ کر آگاہانہ طور پر عاشق نہیں ہوتا ہے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے (324)

مرزا غالب نے بعض فارسی اشعار میں عشقیہ معاملات کو دنیاوی معاملات سے الگ قرار دیا ہے۔ اس امید پہ عشق نہیں کرتے ہیں کہ انھیں کوئی نفع اور سود مل جائے۔ وہ عشق کرتے ہیں کیونکہ عشق کا نقطہ کمال ہے۔ اس میں مصیبتیں بھی ہیں، غم بھی ہے، ہجر بھی اور درد بھی۔ یہ سب دنیاوی معاملات میں نقصان اور خسران سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اپنے اشعار میں واضح طور پر ہمیں آگاہ کرتے ہیں کہ عشق میں سود و زیاں کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ غالب ایک عجیب تشبیہ میں سالک عشق کو تاجر شوق سے تشبیہ دیتے ہیں۔ تاجر کا کام سود و زیاں پہ سوچنا ہے اور عقل سے کام لینا ہے تاکہ اسے تجارت میں نقصان نہ ہوجائے۔ غالب نے مرد عشق کو ایسے سوداگر کی مانند کہا ہے جو تجارت کرنے کے لیے اس راہ پہ چلتا ہے جس کے اختتام میں اس کا تمام سرمایہ ہاتھ سے چلا جاتا ہے۔ غالب کے اس شعر پر غور کرتے ہوئے یہ جواز نکال سکتے ہیں کہ سالک عشق درحقیقت ایک سوداگر کی طرح ہے، وہ خدا سے معاملہ کرتا ہے، دنیا کی تمام خوشیوں اور لذتوں سے ہاتھ دھوتا ہے، دنیاوی زندگی میں یہ عدم تعلق اور عدم وابستگی اور زاہدانہ اندازِ زندگی، ظاہر بیں آدمی کے لیے نقصان اور زیان سے زیادہ کچھ نہیں۔ مگر عاشق ان نقصانات کے بدلے میں معشوق حقیقی کے وجود میں فنا ہوجاتا ہے، جو کمال عشق کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے باوجود بہت کم عاشق ہوتے ہیں جو وصال الٰہی کے لیے دنیاوی راحت و سکون کو چھوڑ سکیں:

بر گریہ بیفزود ز دل ہرچہ فرو ریخت
در عشق بود تفرقہ سود و زیان ہیچ (ص61)
تاجر شوق بدان رہ بہ تجارت نرود
کہ رہ انجامدو سرمایہ بہ غارت نرود (ص96)

### شدتِ عشق:

مرزا غالب کے کلام میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں ان کے اندر شدت عشق کی طرف اشارہ نہ کیا گیا ہو۔ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق غالب کو ایسا مغلوب کردیتا ہے، وہ جنون کی حدوں تک پہنچ جاتے ہیں چنانچہ جوشِ جنونِ عشق سے انہیں ہرجگہ عشق ہی عشق نظر آتا تھا اور عشق کے نامساعد اور ناہموار راہوں کے سامنے خائف نہیں ہوتے۔ غالب جنونِ عشق کی تصویر کشی کرنے کے لیے خود کو مجنوں کی طرح بیابان گرد قرار دیتے ہیں مگر یہ ذوقِ آوارگی انھیں مرنے کے بعد بھی آرام سے سونے کا موقع نہیں دیتی چنانچہ قبر میں بھی ان کی روح پریشان اور بے قرار ہے۔

جوش جنون سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشت خاک ہے (372)
اللہ رے! ذوق دشت نوردی کے بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں (207)

### عشقِ مجازی:

عشقِ مجازی سے مراد وہ عشق ہے جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے۔ عرفا نے اس عشق کے لیے دو درجے مقرر کیے ہیں۔ ایک حیوانی عشقِ مجازی اور دوسرا نفسانی عشقِ مجازی۔ حیوانی عشقِ مجازی وہ عشق ہے جو انسان ایک حیوان کی حیثیت سے دوسرے نوع بشر سے کرتا ہے۔ نفسانی عشقِ مجازی سے مراد وہ عشق ہے جو آدمی معشوقِ انسانی کے نفسانی فضائل سے کرتا ہے۔ عشقِ مجازی دوسرے درجے پر ہی عاشق کے کمال کا ذریعہ فراہم کرسکتا ہے۔ کیونکہ اس کے نفس میں نرمی و شوق کا باعث بنتا ہے۔ اسے غیرِ معشوق سے منقطع کرتا ہے۔ اس عشق میں عاشق کا صرف ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے معشوق، وہ بھی معشوق کے فضائل۔ اس عاشق کے لیے معشوقِ حقیقی کی طرف جانا زیادہ آسان ہوگا۔ اسی وجہ سے صوفی اور عارف عشق مجازی کو حقیقی عشق کا پرتو مانتے ہیں اور دنیا میں تمام حسن اور خوبصورتی میں، شاہد ازلی کا ہی جلوہ دیکھتے ہیں۔ چنانچہ فارسی ادب کے عظیم شاعر باباطاہر کہتے ہیں:

به دریا بنگرم دریا تہ وینم
به صحرا بنگرم صحرا تہ وینم
بہرجا بنگرم کوہ و در و دشت
نشان روی زیبای تہ وینم (ص2)

عشق مجازی کی اہمیت اس بات پر ہے کہ یہ انسان کے دل میں انانیت اور خودغرضی کو مٹا کر تزکیہ نفس کو جاگزیں کر سکتا ہے چنانچہ عاشق، معشوق کو خود پر ترجیح دیتا ہے اور اس کے عشق میں جان قربان کرنے سے دل میں خوف و ہراس آنے نہیں دیتا۔ مرزا غالب کے کلام میں ایسے اشعار ایک بڑی تعداد میں ملتے ہیں جن میں معشوقِ زمینی پر اپنا جذبہ عشق کا اظہار کرتا ہے۔ اس عشق کی شدت ان کے اندر اتنی زیادہ ہے کہ وہ ہر لمحہ اور ہر جگہ معشوق کی یاد میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ باغ و گلشن کے پرسکون ماحول میں معشوق کی اچھائیوں کو اپنے اندر تازہ کرتے ہیں اور زندگی کے مشکل وقتوں میں معشوق کی تندخوئی کو یاد کرتے ہیں:

در گلشنم و آرم ازان روی نکو یاد
در دوزخم و خواہم ازان تندی خو داد (ص94)

مرزا غالب اس مجازی عشق و محبت میں اتنے غرق تھے کہ ان کو جینے اور مرنے کا فرق نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ زندہ بھی اگر تھے تو وہ محبوب کے ناز و ادا اور حسن پر جان فدا کرنے کے لیے۔ دراصل محبوب کے دیکھنے سے وہ زندہ دلی محسوس کرتے ہیں:

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم نکلے (370)

ہر عاشق کی طرح مرزا غالب کی بھی یہی تمنا اور خواہش ہے کہ جب جان دینے کا وقت آئے تو یہ جان اپنے محبوب کے لیے قربان کرے۔ وہ ایک شعر میں بیان کرتے ہیں کہ رقیب (دشمن) سے غالب کی پرخلوص محبت دیکھی نہیں جاتی اور وہ رشک و حسد میں رہتا ہے۔ انجام میں بھی رقیب کے حسد کے سبب غالب کا قتل ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ محبوب کی محبت اور عشق کے بیمار تھے اور اسی عشق میں جان دینے کی خواہش رکھتے تھے مگر ان کی یہ بدنصیبی تھی جو دوست کے ہاتھ نہیں دشمن کے ہاتھ قتل ہوئے۔ اور اس سے بڑا دکھ کیا ہو سکتا ہے۔ اس شعر کا باطنی مفہوم یہ ہے کہ عمر بھر رقیب کی جلن اور رشک کی وجہ سے غالب کو معشوق کی توجہ اور محبت حاصل نہ ہو سکی:

عشق میں بیداد رشک غیر نے مارا مجھے
کشتہ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست (90)

عاشق کو عشق سے جو چیز سب سے زیادہ ملتی ہے وہ ہے غم و درد۔ معشوق سے دور رہنے کا درد، معشوق کی عزت محفوظ رکھنے کے لیے عشق کو چھپانے کا ملال، معشوق کی بے مہری اور بے توجہی کو برداشت کرنے کا غم اور رقیب کی خاطر خواہ پرستاری کا اندوہ یہ سب عاشق کی بیتی ہوئی زندگی کو غم کا خزینہ بنا دیتا ہے اس وجہ سے ایک شعر میں غالب نے اپنی گزری ہوئی عمر کو گنجینۂ غم سے تشبیہ دی ہے جو سرانجام معشوق پہ قربان کیا جاتا ہے:

عمری کہ بہ سودای تو گنجینہ غم بود
اینک بہ تو دادیم تو در عیش بسر بر

(ص101)

مرزا غالب کی زندگی میں یہ بدنصیبی رہی کہ ان کو کبھی بھی محبوب کا وصال میسر نہیں ہوا۔ انھوں نے ہجرِ یار کو اپنی قسمت سمجھ کر قبول کیا۔ اس لیے انھوں نے محبت کے انجام کو آمال و آرزو کی شکست کہا ہے:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا (38)

حاصل الفت نہ دیکھا جز شکست آرزو
دل بہ دل پیوستہ گویا یک لب افسوس تھا (70)

### معشوق کا ظاہری حسن:

معشوق کی تعریف و تمجید کرنا اور اس کے ظاہری حسن کی نشاندہی کرنا عشقیہ مضامین کا جزو لاینفک ہے۔ مرزا غالب نے بھی کسی حد تک معشوق کے حسن و جمال کی تصویر کشی کی ہے تا کہ اس کی ظاہری خوبصورتی معلوم ہو جائے۔ ایک فارسی شعر میں معشوق کی کالی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو عاشق کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی اور ان کے چہرے کو چاند کی طرح خوبصورت کہا ہے جس کی وجہ سے معشوق غالب کو اپنا رخ دکھانے سے انکار کرتی ہے۔ غالب نے معشوق کے چہرے کی خوبصورتی کا خاکہ قاری کے ذہن میں تیار کرنے کے لیے تشبیہوں کا سہارا لیا ہے چنانچہ ایک شعر میں چہرے کے حسن کو پھول کے مانند قرار دیا ہے جس کی وجہ سے موسم بہار میں باغ کا ایک ایک پھول انھیں محبوب کے خوبصورت چہرے کی یاد دلاتا ہے۔ دوسرے شعر میں اسے چودھویں رات کے چاند سے موازنہ کیا ہے جو حسن ماہ کا کمال ہے۔ اس شعر میں غالب نے اگرچہ ماہ کامل کے حسن کی تائید کی ہے مگر معشوق کے خوبصورت چہرے کو بھی اس سے زیادہ حسین و جمیل قرار دیا ہے۔ اگرچہ معشوق غالب سے تغافل سے پیش آتا ہے مگر اس کی ایک ہی نگاہ غالب کی جان لینے کے لیے کافی ہے اور یہ ہے معشوق کی آنکھوں کا کمال:

حسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے (294)

چشمی سیاہ دارد یعنی بما نبیند
روی چو ماہ دارد اما بہ ما ندارد (ص79)

عارض گل کو دیکھ روئے یار یاد آیا اسد
جوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے (ص336)

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہوگئے (ص356)

مرزا غالب معشوق کے ہونٹ سے غافل نہیں رہے چنانچہ ایک فارسی شعر میں معشوق کے ہونٹ کی تعریف کرتے ہوئے اسے لعل سے تشبیہ دی ہے اور اس کے ہونٹ کو جوئے مئے کی طرح نشیلے اور جوئے شہد کی طرح شیریں و میٹھا کہا ہے۔ غالب نے ایک اردو شعر میں کہا ہے کہ معشوق اپنی شیرینی لب کی وجہ سے جتنا بھی عاشق پر غصہ کر کے اسے گالی دے اس سے اس کے ہونٹوں کی مٹھاس کم نہ ہوگی:

جوئی از بادہ و جوئی ز عسل دارد خلد
لب لعل تو ہم این است و ہم آنست مرا (ص17)

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا (ص50)

غالب نے بعض اشعار میں معشوق کے ناز و ادا اور اس کے بولنے کے انداز کی داد دی ہے۔ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے لیے صرف معشوق کا ظاہری حسن اہم نہیں تھا بلکہ غالب اس کے حسنِ ادا کے بھی قائل تھے:

رہا بلا میں بھی مبتلائے آفت رشک
بلائے جان ہے ادا تیری اک جان کے لیے (ص394)

بسکہ ہموارہ دلاویزی و شیرین حرکات
سایہ طوبی و جوی عسلی را مانی (ص159)

بلائے جان ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا (ص41)

نگارم سادہ و من رند رنگ آمیز رسوایم
چہ نقش مدعا بندم بدین روی سیاہ از وی (ص155)

معشوق کے ان سب ظاہری کمالات کی وجہ سے غالب کا عاشق دل اس حسن کو دیکھنے سے بھر نہیں سکتا اور ان کے حسن کی پیاسی آنکھیں سیراب نہیں ہوتیں:

سیرم نتوان کرد ز دیدار نکویان
نظارہ بود شبنم و دل ریگ روان ہای (ص161)

## معشوق کے اخلاقی صفات:

مرزا غالب نے بعض اشعار میں معشوق کے مختلف اخلاقی صفات کی طرف اشارہ کیا ہے جو کلاسیکی معشوق کی یاد کو زندہ کرتا ہے۔ انھوں نے کئی اشعار میں ستم گر، ستم ظریف، ستم ایجاد، ظالم، بے مہر اور سنگدل جیسے الفاظ وصفات سے معشوق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غالب کے کلام میں معشوق کا سب سے نمایاں رنگ اس کی جفاگری اور سنگدلی ہے۔ وہ ظلم وستم جو معشوق اپنے عاشق پر ڈھاتا ہے کوئی شخص اپنے دشمن کے لیے بھی گوارا نہیں سمجھتا ہے۔ وہ بغیر کوئی خاص وجہ کے عاشق پر جفا کرتا ہے اور اس کی پریشانی اور غم سے خوشنود ہوتا ہے:

نہ از مہرست کز غالب بہ مردن نیست راضی
سرت گردم تو میدانی کہ مردن نیست دشوارش (ص110)

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسد
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا (ص53)

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں (ص170)

نوید امن ہے بیداد دوست جان کے لیے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسمان کے لیے (ص394)

کسی پر بے دردی سے ظلم و جفا کرنے کی ایک اہم وجہ، پتھر دل ہونا ہے۔ یہی خصوصیت غالب کے معشوق میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی سنگدلی کی وجہ سے وہ کبھی بھی نظر لطف وکرم سے عاشق کی طرف نہیں دیکھ سکتا ہے اور بے توجہی سے عاشق کے ساتھ پیش آتا ہے۔ مرزا غالب نے معشوق کی سنگدلی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ایک شعر میں خود کو اس پرندہ سے تشبیہ دی ہے جو عشق کے جال میں گرفتار ہوگیا ہے اور اس عشق سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ اسی شعر میں غالب نے معشوق کو اس صیاد سے تشبیہ دی ہے جو اپنا شکار جال میں پھنستے ہوئے دیکھ کر خوشی سے اسے ذبح کرنے کی گفتگو کرتا ہے اور یہ نہیں سوچتا ہے کہ اس پرندہ پر کیا گزر رہی ہے جو اپنے ذبح ہونے کی خبر صیاد کے منہ سے سن رہا ہے:

رہم افتادہ بہر دانہ سوی دام صیادی
کہ حرف ذبح با ہمراز خویش اندر کمین گوید (ص93)

یہی عشق کی علامت ہے کہ معشوق کو اسی طرح قبول کریں جس طرح وہ حقیقت میں ہے اور غالب نے معشوق کی ہر بری عادت اور خصلت کو تسلیم کیا ہے۔

**عشقِ حقیقی:**

بر دست و پای بند گرانی نہادہ ای
نازم بہ بندگی کہ نشانی نہادہ ای (ص153)

عشقِ حقیقی، اس ذاتِ الٰہی سے بے انتہا اور شدید محبت کرنے کا نام ہے جو ذاتِ مطلق ہے۔ عشقِ حقیقی وہاں ہے جہاں معشوق خدا ہو۔ حق حقیقی معشوق ہے اور اس کے علاوہ جو بھی ہے مجازی معشوق ہے کیونکہ عرفا کے ہاں ذات الٰہی کے علاوہ سب کا وجود مجازی اور غیر حقیقی ہے۔ تمام عرفانی مکاتیب میں یہ عشق سب سے بنیادی اور اہم مسئلہ قرار دیا گیا ہے۔ عرفاء کے نزدیک، ہستی کی بنیاد اس عشق الٰہی پر استوار کی گئی ہے۔ زمین و آسمان اور ساری موجودات کی جنبش اور حرکت اس عشق سے وابستہ ہے۔ عشق حقیقی جو خدا سے عشق ہے یقیناً انسان کے کمال کا باعث بنتا ہے۔ کیونکہ عاشق تمام امور میں خود کو معشوق کی طرح بنانے کی کوشش کرتا ہے اور کیا خدائی رنگ پانے سے برتر کوئی کمال موجود ہے؟ صوفیانہ شاعری میں، شاعر دنیا کے ہر حسن وخوبی کا رشتہ عشق الٰہی سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہے اور ہر چیز کے مبداء ومنشاء میں اسی عشق کی جستجو کرتا ہے۔

مرزا غالب کے عشقیہ کلام میں دونوں پہلو مترشح ہیں۔ پہلا عشق حقیقی اور دوسرا عشق مجازی۔ مرزا غالب کے عشقیہ اشعار کی یہ خوبی ہے کہ ان کے اکثر وبیشتر اشعار میں دونوں پہلو ظاہر ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کے بعض عشقیہ اشعار کو مجازی تعبیر کرتے ہوئے ان میں حقیقی عشق کا سراغ بھی ملتا ہے۔ تو یہ قاری پر ہے کہ اسے مجازی عشق قبول کرے یا حقیقی عشق۔ اس کے باوجود ان کے فارسی اردو کلام میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جو صرف اور صرف عشق حقیقی کی طرف اشارہ کرتے ہوں۔ عشق حقیقی سے متعلق غالب کا یہ خیال تھا کہ یہ عشق وہ چیز ہے جو خدا نے ہی انسان کے دل میں ڈالا ہے اس لیے جس کے پاس دھڑکتا ہوا دل ہو اس میں عشق کہیں نہ کہیں چھپا رہتا ہے:

ہر کہ دل است در برش داغ تو رویدش ز دل
تا چو بہ دیگری دہد باز بری بہ داوری (ص162)

سالک طریق عشق کے دل میں عشق الٰہی کو پیدا کرنے کا ایک کارآمد طریقہ خداوند کے جمال اور جمالیہ اسماء پر توجہ کرنا اور اس کی خوبیوں کو ہمیشہ یاد کرنا ہے جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ ناخودآگاہ اور بے اختیار طور پر ذات الٰہی سے محبت کرنے لگتا ہے جو عشق حقیقی کا پہلا قدم ہے۔ اس وجہ سے مرزا غالب ایک شعر میں بس یہی دعا کرتے ہیں کہ ان کے لب پر صرف اور صرف اللہ کے صفات، جمال وکمال کا ذکر جاری ہو اور ان کی زبان ذکر حق سے کبھی خاموش نہ ہو جائے۔ اس طرح عاشق کے خودآگاہ ہوش کے صفحے پر اللہ کی تصویر حک کی جائے گی اور اس کا چہرہ اس آئینہ کی طرح ہو جاتا ہے جس میں صفات الٰہی نظر آنے لگتے ہیں:

لبم از زمزمہ یاد تو خاموش مباد
غیر تمثال تو نقش ورق ہوش مباد (ص89)

چہ تماشاست ز خود رفتہ خویشت بودن
صورت ما شدہ عکس تو در آئینہ ما (ص17)

ذکر خداوند صرف انسانوں کے لب پر جاری اور ساری نہیں ہے بلکہ کائنات میں ہر شے عشق الٰہی کا زمزمہ ہے اور اس عشق کو پانے کے لیے پریشان اور بے قرار رہتی ہے۔ اس مضمون کو بیان کرنے کے لیے مرزا غالب نے سمندر اور حباب کی خوبصورت تشبیہ کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے سمندر کو سالکِ عشق اور اس کی اوپری سطح پر حبابوں کو پاؤں تلے کے آبلوں سے مثال دی ہے جو عشقِ الٰہی کی پُرخار راہ کو طے کرنے کی وجہ سے نمودار ہوئے ہیں:

دریا ز حباب آبلہ پای طلب توست
نور نظر ای گوہر نایاب کجائی؟ (ص161)

غالب کے کلام میں معشوق ازلی کی جلوہ گری اور اس حسن کو پانے کی خواہش کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ عشق حقیقی میں انسان کے دل میں ایک ہی تمنا رہتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا جلوہ دیکھ سکے اور اس کا تمام وجود اور ہستی ان کے ذات پاک سے ضم ہو جائے۔ مگر یہ کہ اس کے اندر جلوہ حسن ازلی کو دیکھنے کی صلاحیت کس حد تک ہے اسے معلوم نہیں۔ مرزا غالب کا ایک شعر عاشق کی اسی عدم صلاحیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ اس شعر میں اپنے ناعاقبت اندیش دل کو عشق کی شدت کو، قابو میں رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں اور اسے واقعۂ طور اور حضرت موسیٰ کی یاد دلاتے ہیں کہ خدا کا جلوہ دیکھنے کے خواہاں تھے۔ مگر انسان کی خاکی وجود خدا کی عظمت اور بزرگی کو دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لیے خدا کے نمودار ہونے سے کوہ طور بھی خاکستر ہو گیا اور حضرت موسیٰ جو اللہ کہ برگزیدہ اور خاص بندہ تھے، اس کی تاب نہ لا کر بے ہوشی کے عالم میں چلے گئے۔

اے دل ناعاقبت اندیش ضبط شوق کر
کون لاسکتا ہے تاب جلوہ دیدار دوست (90)

اس کے باوجود مختلف لوگوں میں عشق کو دریافت کرنے کی الگ صلاحیت ہوتی ہے اس وجہ سے مرزا غالب نے ایک اور اردو شعر میں طریقِ عشقِ حقیقی کے سالک کو یہ نوید دی ہے کہ ہر انسان میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ درک کرنے کی الگ ظرفیت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ عاشق حقیقی کو یہ

حوصلہ دے پاتا ہے کہ اگر آج تک کسی عاشق کو یہ نصیب نہیں ہوا کہ اللہ کا جلوہ دیکھ سکے پھر بھی وہ مایوس نہ ہو اور ہمت نہ ہارے کیونکہ سب عاشق ایک جیسے نہیں ہوتے اور اس میں یہ صلاحیت ہوسکتی ہے:

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی (ص388)

ذاتِ پاک کا جلوہ دیکھنے کے خواہشمند عاشق کبھی کبھی بھول جاتا ہے کہ اللہ ہمارے رگ گردن سے بھی زیادہ ہم سے قریب ہے اور صرف اسے دل سے محسوس کرنا چاہیے۔ اسی مضمون کو مدنظر رکھتے ہوئے مرزا غالب نے ایک فارسی شعر میں خداوند سے اس نزدیکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ میرے اندر وہ طاقت اور صلاحیت نہیں کہ آپ کو درک کرسکوں اس لیے ان سے یہ التجا کی ہے کہ وہ یہ پردہ اور نقاب جو اس کے اور خالق کے درمیان ہے، ہٹادیں:

تو در آغوشی و دست و دلم از کار شدہ
تشنہ بی دلو و رسن بر سر چاہی دریاب (ص33)

مرزا غالب خود کو ان سالکین عشق الٰہی میں قرار دیتے ہیں جن کے لیے قرب الٰہی کے سامنے بہشت اور اس کے آسایش وسکون کی کوئی اہمیت نہیں ہے چنانچہ اگر چشمہ کوثر ان کو مل جائے تو وہ اس کا ایک بوند پانی بھی نہیں پئیں گے اور اگر درخت طوبیٰ ان کو دیا جائے اس کا خار و خاشاک کے برابر کا رتبہ دیں گے۔ اسی وجہ سے وہ جنت پرست زہاد پر طنز کرتے ہیں جو بہشتی نعمتوں کو حاصل کرنے کی وجہ سے عمر بھر پرستش حق میں مصروف رہتے ہیں اور خود کو ان سے موازنہ کرتے ہوئے بہشتی نعمتوں کی ارزش کو اپنے ہاں طاق نسیاں اور فراموشی میں اک گلدستہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں دیتے:

کوثر اگر بہ من رسد، خاک خورم ز بی نمی
طوبی اگر ز من شود، ہیمہ کشم ز بی بری (ص162)

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا (ص17)

عرفا اس بات پر متفق ہیں کہ عشق الٰہی تمام کائنات میں موجود ہے چنانچہ دنیا میں ایسا کوئی ذرہ نہیں جو عشق الٰہی سے بے بہرہ ہو۔ آیات و روایات میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ خدا کی شناخت، تسبیح خداوند و اس کی محبت اور اسے پانے کی کوشش تمام موجودات میں موجود ہے۔ اسی وجہ سے مرزا غالب ایک شعر میں سلوک میں صحیح رستے میں قدم رکھنے کے لیے دنیا کے ذرے ذرے کو اپنا راہنما قرار دیتے ہیں:

ای تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہ تو رروی نیست
در طلبت توان گرفت بادیہ را بہ رہبری (ص162)

وہ نہ صرف خود کے خاکی وجود کو بلکہ تمام کائنات کی ہستی کو عشق الٰہی کی جلوہ گری سے وابستہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ دنیا اور ماتحت اللہ پاک کے جلوہ حسن کے علاوہ کچھ اور نہیں اور ہستی کا مطلق حقیقت ان کی وحدانیت پر ہے۔ بالفاظ دیگر اگر اللہ اپنا حسن دکھانے کے متمنی نہیں ہوتے تو نہ کوئی دنیا وجود میں آتی نہ کوئی نبات اور بنات:

دہر جز جلوہ یکتایی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں (ص405)

ہے تجلی تری سامان وجود
ذرہ بے پرتو خورشید نہیں (ص157)

غالب خدا کے وجود کو ہر چیز میں دیکھنے کی جستجو کرتے ہیں اور تمام مخلوقات میں ان کا جلوہ دیکھتے ہیں مگر آشکارا اس بات کی تصدیق کرتے ہیں خدا کی ذات ان تمام مخلوقات سے الگ اور مختلف ہے:

ہرچند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے (ص331)

### سلوکِ عشق الٰہی:

سلوکِ عشق الٰہی سے مراد وہ مراحل اور منازل ہیں جو عاشق کو، معشوق ازلی کے وصال کے لیے طے کرنا پڑتا ہے۔ جب آدمی کے دل میں حُبِ الٰہی پیدا ہوتی ہے وہ طریق عشق کی پہلی منزل پر قدم رکھتا ہے۔ سلوک کے آغاز و انجام میں عشق موجود نہیں ہے۔ سلوک کا آغاز خدا کی محبت سے ہوتا ہے۔ اس ابتدائی منزل میں عشق نہیں ہے۔ عشق کی پیدائش طے طریق عشق سے میسر ہوتی ہے۔ سلوک عشق کا راستہ طویل اور پُر فراز و نشیب ہے اور عاشق کو محبت کے مختلف مراحل سے عبور کرنا چاہیے۔ مختلف عرفا اور شعراء نے ان مراحل پر الگ الگ نام دیا ہے۔ سلوک عشق کے مراحل، عطار نیشابوری کے منطق الطیر میں بیان کیے گئے ہیں، جہاں سیمرغ سے ملنے والے پرندے سات وادی سے گزرتے ہیں اور انجام میں سیمرغ میں ہی خود کے وجود کو دیکھتے ہیں۔ یہ سات وادی ہفت شہر عشق کے عنوان سے مشہور ہیں۔ حقیقی عاشق کو ان مراحل سے عبور کرنے کے لیے تمام دنیاوی آرزوؤں اور تمناؤں سے بے نیاز ہونا چاہیے اور حُب دنیا کو خیر باد کرنا چاہیے۔ اس روحانی سیر و سلوک میں عاشق کا دل ہر نفسانی آفت و بلا سے پاک ہوجاتا ہے جسے ہر کوئی طے کر کے منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس راہ میں رکاوٹیں اور موانع ہیں، سختی اور مصائب ہیں، مختلف آزمائش اور

امتحان ہیں، عشق سے گمراہ ہونے کا سارا ساز وسامان بھی موجود ہے۔ سلوک عشق فنافی اللہ کے مقام میں اپنے اختتام پر پہنچ جاتا ہے۔ اس آخری منزل میں عشق بھی محو وفنا ہوجائے گا کیونکہ جہاں عشق ہے وہاں عاشق بھی ہے اور سیر وسلوک کے انتہا میں معشوق کے علاوہ کچھ اور باقی نہیں ہوتا۔ عاشق کو راہ عشق طے کرنے کے لیے تیاری کرنی چاہیے۔ یہ راہ عقل وعلم کے ذریعے طے نہیں کی جاتی ہے جس کی طرف مرزا غالب نے بھی ایک فارسی شعر میں اشارہ کیا ہے:

در راہ عشق شیوہ دانش قبول نیست
حیف است سعی رہرو پا از جبین شناس (ص106)

مرزا غالب سختی راہ عشق سے بخوبی واقف ہیں اس وجہ سے فارسی اور اردو کلام میں اس دشوار گزار راستے کی طرف اشارہ کیا ہے اور عاشق کو اس کے پر پیچ وخم مراحل سے آگاہ کر دیا ہے۔ انھوں نے ایک فارسی شعر میں راہ عشق کی سختی کو اندھیری رات یا شبِ سیاہ سے تشبیہ دی ہے جس سے گزرنا بے حد مشکل کام ہے اور وصال یار کو روز روشن سے تشبیہ دی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ عشق کے میدان میں قدم رکھنا اور انتہا تک پہنچنا آسان کام نہیں ہے۔ عاشق کو اگر وصال چاہیے اسے عشق میں موجود تمام مشکلات کا سامنا کرنے کی طاقت چاہیے اور اس کے پیچ وخم سے گزرنے کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔ درحقیقت عشق کی راہ میں سختیوں اور مشکلوں سے حوصلہ وہمت کے ساتھ گزر جانا ہی کامرانی کی دلیل اور اس کے مقیاس و میزان پر کھرا اترنے جیسا ہے:

داغ ناکامی حسرت بود آئینہ وصل
شب روشن طلبی، روز سیاہی دریاب (ص33)

محبت در بلا اندازہ می جوید مقابل را
کتان ہوش را مر جلوہ گل ماہتابستی (ص163)

غم آغوش بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے (ص377)

ان مشکل آزمائشوں کا سامنا کرنا اور ان پر غلبہ کرکے منزل مقصود تک پہنچنا دشواریوں اور سختیوں سے خالی نہیں۔ غالب نے راہ عشق کو میدان جنگ سے اور عشق کو نبرد پیشہ جنگاور سے تشبیہ دی ہے جو مرد مبارز کو طلب کرتا ہے۔ سست اور سہل پسند عاشق اس میدان میں آنے سے پہلے ہی ایک دھمکی سے ہی ہار جاتے ہیں اور حقیقی عاشق اس میدان سے سربلند ہوکر کمال عشق کے مرحلے پر فائز ہوجاتا ہے۔

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا (ص12)

غالب نے ایک شعر میں ان سست عنصر لوگوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے جو راہ عشق کو سہل اور آسان سمجھ لیتے ہیں۔ وہ لوگ جو ایک چھوٹے کانٹے کا درد برداشت نہیں کر پاتے، راہ عشق تیغ بُرّاں پر گزرنے جیسا ہے، کیسے پار کر پائیں گے:

وہ کہ با چنین طاقت راہ بر دم تیغ است
پای برنمی تابد رنج کاوش خاری (ص155)

ایک فارسی شعر میں مرزا غالب نے اس راستے پر قدم رکھنے والوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اپنے وجود کو ہستی سے پاک کرنا چاہیے۔ عاشق کو دنیا کے ان تمام تعلقات سے رشتہ منقطع کرنا ہے جو اسے عشق کے راستے سے منحرف کرسکتا ہے اور اس کا سامان راہ بھاری ہوتا ہے۔ غالب چاہتے ہیں کہ عاشق اپنی ہستی اور وجود سے بھی ہاتھ دھو کر رخت سفر باندھ لے۔ کیونکہ عشق کا مطلب ہے خود کے عشق سے تہی ہونا اور کسی اور کا عشق دل میں بسا دینا۔

زہستی پاک شو گر مرد راہی کاندرین وادی
گرانی ہاست رخت رہرو آلودہ دامان را (ص31)

بے شک عاشق کے دل میں ہزار تمنائیں ہیں مگر عشق کی راہ میں کامیابی کے لیے اسے صبر وتحمل سے کام لینا پڑے گا۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک (ص132)

سلوک عشق کی سختی کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرزا غالب نے خود کو حقیقی عاشق جانتے ہوئے بھی میدان عشق میں اپنے آپ کو کم تجربہ اور مبتدی ہی سمجھ کر کہا ہے:

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا (ص4)

بہ لفظ عشق صد رہ کوہ و دریا درمیان گفتن
بیاموزید تا پیشش برید افسانہ خوانان را (ص32)

□□□

**Muneera Nazad Shaikh**
Research Scholar
311, Ganga Hostel
JNU, Delhi-110067

شیبا پروین

# طارق چھتاری کی افسانہ نگاری

اردو افسانے کو نثری تصنیف میں جو مرکزیت حاصل ہے اس کے عہد بہ عہد تبدیلی اور ترقی کی وجہ سے ہے۔ترقی پسند تحریک کے بعد اردو افسانے پر جس رجحانات نے سب سے زیادہ اپنے نقوش ثبت کیے ان میں جدیدیت کا نام سب سے نمایاں ہے۔جدیدیت میں حقیقت نگاری کا رجحان ماند پڑ گیا اور علامت نگاری کو عروج حاصل ہوا۔جدیدیت کے بعد افسانہ نگاروں میں ایسے افسانہ نگار بھی شامل ہیں جنھوں نے جدیدیت کے دور میں افسانہ نویسی کی ابتداء کی اور اس طرز کے چند افسانے بھی لکھے لیکن جب انھیں یہ احساس ہوا کہ ایسے افسانوں کا مستقبل تابناک نہیں ہے تو انھوں نے افسانوی سمت کو نیا رخ دیا اور کہانی کے جوہر کی طرف واپس پلٹ آئے ساتھ ہی علامت کو نئی معنویت عطا کی۔اس ضمن میں سلام بن رزّاق ،انیس رفیع، نیر مسعود، عبدالصمد اور طارق چھتاری وغیرہ کے نام اہم ہیں۔انیس اشفاق کے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے:

> ’’70ء کے دہے میں سب جانتے ہیں، علامتی کہانی کے نام
> پر تجریدیت کی ایسی بچکانہ مثالیں سامنے آئیں کہ ماجرا تو دور
> ہم اس کے اندر موضوع کو ڈھونڈتے رہ گے‘‘

(انیس اشفاق، اردو افسانے میں طارق کا امتیاز و اختصاص، طارق چھتاری گنجینۂ معنی کا طلسم، مرتب ڈاکٹر حامد رضا صدیقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔20186 ،ص158)

اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے سلام بن رزآق لکھتے ہیں:

’’ساٹھ اور ستر کی دہائی میں ابہام پرستی، لایعنیت اور تجریدیت

کے نام پر جو چیستانی افسانے لکھے گئے،انھوں نے پوری نسل کو گمراہ کیا اور اردو افسانہ بے سمتی کا شکار ہو گیا۔لیکن 1970 کے بعد افسانے کے قدم دوبارہ ٹھوس زمین پر جمنے لگے اور نئے لکھنے والوں نے ترقی پسند افسانہ اور جدید افسانے کے بین بین ایک نیا لہجہ دریافت کرنے کی کوشش کی جس میں کہانی پن کے ساتھ ابہام کا حسن،علامت کی تہ داری اور استعارے کی دلکشی اس طرح شامل ہو گئی کہ عصری افسانہ ترقی پسند افسانے سے زیادہ ارضی اور جدید افسانے سے زیادہ خیال انگیز ہو گیا''

(سلام بن رزاق،طارق چھتاری اور ان کے افسانے،ایضاً،ص 245)

طارق چھتاری نے 1975 میں کہانیاں لکھنا شروع کیں۔طارق چھتاری کا تعلق افسانہ نگاروں کی اس نسل سے ہے جنھوں نے کہانی کے جوہر کو پوری طرح ملحوظ رکھا اور علامت سے بھی استفادہ کیا ۔طارق چھتاری کے افسانے حقیقت،علامت،رمزیت اور تجریدیت کے باہمی آمیزش سے ایک ایسا بیانیہ خلق کرتے ہیں جو اپنے اظہار میں پہلودار بھی ہے اور جاذب نظر بھی۔

طارق چھتاری حساس طبیعت کے مالک ہیں،نرم لہجہ اور شائستہ گفتگو ان کی پہچان ہے۔افسانوی ادب میں ایک معتبر افسانہ نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔اب تک ان کا صرف ایک ہی افسانوی مجموعہ ''باغ کا دروازہ'' منظر عام پر آیا ہے لیکن اس ایک افسانوی مجموعے نے ان کی شہرت و بلندی میں وہ اضافہ کر دیا جو متواتر طور پر لکھنے والوں کو بھی حاصل نہیں ہے۔طارق چھتاری کے افسانوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی شخصیت کے اندر نہ جانے کتنے جواہر ریزے سالہا سال سے موجود تھے جو وقت کے ساتھ منظر عام پر آئے اور اردو افسانے کی دنیا کو مالا مال کر گئے۔یوں تو افسانوی دنیا میں لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے لیکن کم لکھ کر اپنی عظمت و بلندی کا اعتراف کرنے پر مجبور کرنے والی شخصیت بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ان کے افسانے کو پڑھ کر قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ کہانی تو اس کے آس پاس سے لی گئی ہے اور اس کی اپنی ذات سے متعلق ہے۔یہ افسانے اس سے بہت کچھ کہتے ہیں جسے وہ علامتوں اور اشاروں کے ذریعہ سمجھ جاتا ہے۔طارق چھتاری کے افسانوں میں شور و غل اور ہنگامہ نہیں ہے بلکہ ایک مدھم آنچ سے سلگنے والے وہ سوالات اور وہ مسائل ہیں جو ایک عام انسانی زندگی کا محور ہیں۔ان کی شخصیت کی مانند ہی ان کے افسانے بھی شائستہ اور نرم لہجہ کے پروردہ ہیں۔اس بات کی مزید وضاحت عبدالصمد یوں بیان کرتے ہیں....

''کم لکھ کر اپنے ہم عصروں میں ایک ممتاز اور مستحکم مقام بنانے والے چند لوگوں میں طارق کا نام سرفہرست ہے''

(عبدالصمد،طارق چھتاری-کہانی سے جڑا ہوا افسانہ نگار،ایضاً،ص 254)

ان کی کہانیوں کا مجموعہ اگست 2001 میں ''باغ کا دروازہ'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں 19 کہانیاں تھیں بعد میں ''بندوق'' کے نام سے ایک اور کہانی کا اضافہ ہو گیا۔زمانی اعتبار سے ان کہانیوں کو ترتیب دے کر شامل نہیں کیا گیا ہے۔ان کی پہلی کہانی ''دھوئیں کے تار'' آخری دور کی کہانی ہے اس لیے ایک نئے ذائقہ کا احساس کراتی ہے جب کہ سب سے آخری کہانی ''چابیاں'' بہت پہلے لکھی گئی تھی۔''باغ کا دروازہ'' کا آغاز ''دھوئیں کے تار'' سے ہوتا ہے۔

افسانہ ''دھوئیں کے تار'' محبت اور جنس کی دنیا میں لے جاتا ہے، اس کہانی کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عشق کا سفر ہی اس کی تکمیل ہے، عشق میں وہ وقت بھی آتا ہے جب محبت کو پالینا غیر ضروری محسوس ہونے لگتا ہے۔ایک ایسا وقت جہاں نہ کوئی حسد ہوتی ہے نہ کوئی جنسی خواہش کیونکہ عاشق اس عرفان ذات کو پالیتا ہے جسے پالینے کے بعد اس کی آرزوؤں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔اس کہانی کے کردار رعنا اور سمیر کالج کی محبت کو پیش کرتے ہیں جن کے ذریعہ افسانہ نگار کا مقصد عشق و محبت کا پیغام دینا نہیں بلکہ انسانی فطرت کے مختلف چہروں کو اجاگر کرنا ہے۔انسانی فطرت کے کئی Pattern ہیں۔محبت کو قید نہیں کیا جا سکتا ہے یہ وہ شے ہے جو کبھی بھی کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ایک وقت میں ایک سے زیادہ لوگوں سے محبت کا ہو جانا اور اصل محبت کی پہچان نہ کر پانا ایک نفسیاتی عمل ہے۔طارق چھتاری اپنے افسانوں میں حال،ماضی اور مستقبل کے بیچ ایک منطقی ترتیب قائم کرتے ہیں جس سے ذہین قاری تو پل بھر میں محظوظ ہو جاتا ہے لیکن عام ذہنی صلاحیت رکھنے والا لطف اندوز نہیں ہوتا۔

دوسرا افسانہ ''آن بان'' ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ سماج میں موجود جھوٹی آن بان کی کہانی ہے جس کے چکّر میں پڑ کر معصوم زندگی برباد ہو جاتی ہے۔اس کہانی میں راجپوتوں اور زمینداروں کی انا پرستی اور رسوم و رواج کو لے کر ان کی عقیدت پسندی کو کچھ اس طرح سے دکھایا گیا ہے کہ ان رواجوں کی آڑ میں معصوم زندگی کو برباد کرنے والوں کے خلاف ایک شدید نفرت کا جذبہ اٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔زمینداروں کی بے جا انا اور مفاد پرستی کے باعث اس کہانی کا ہیرو ہری سنگھ اور ہیروئن لجاً پروان چڑھ جاتے ہیں۔ہری سنگھ جو بچپن میں ماں کی موت کے صدمے کو

برداشت نہیں کر پاتا ہے اور اسے دورے کی بیماری لگ جاتی ہے۔ وید جی کے مشورے پر جب اس کی شادی لجا سے ہوتی ہے تو وہ بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن لجا کے پتا جی اسے آ کر لے جاتے ہیں اور پھر کبھی اسے واپس نہیں بھیجتے۔ ہری سنگھ کا باپ بھی اس کی التجا پر اسے لانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وید جی کی سکھائی ہوئی اخلاقی تعلیم ہری سنگھ کی زندگی کو اجیرن بنا دیتی ہے۔ بالآخر ہری سنگھ کا پتا بہو کو لینے اس کے گھر جاتا ہے لیکن لجّا کے پتا کو اس بات پر اعتراض ہوتا ہے کہ ٹھاکروں کے اندر اگر انا اور غرور کی جگہ اخلاق ہو تو وہ ٹھاکر ہی نہیں، اس طرح وہ لجا کو کبھی بھی نہیں بھیجتے۔ لجّا ایک بچّے کی ماں بن جاتی ہے۔ ہری سنگھ کی حالت گزرتے وقت کے ساتھ خراب ہونے لگتی ہے، وہ دن و رات صرف لجاّ اور اپنے بچّے کے بارے میں سوچتا ہے اور آخر کار اایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب گاؤں والے اسے پاگل کہہ کر مارتے ہیں اور وہ مر جاتا ہے۔ وید جی کے سکھائے ہوئے سنسکار اس کے کام نہیں آتے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ افسانہ مکمل طور پر نفسیاتی ہے۔ کہانی کے پلاٹ میں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ الفاظ اور جملوں کی صحیح ترتیب کا ایسا برمحل استعمال ہوا ہے کہ کہانی کا کوئی بھی حصّہ اور کوئی بھی واقعہ غیر ضروری محسوس نہیں ہوتا۔ جھوٹی آن بان اور انا پرست لوگوں کے خلاف یہ کہانی شدید ردّ عمل ہے۔

افسانہ ''کھوکھلا پہیا'' ماڈرن زندگی کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جس کی معاشی ضرورتیں قبروں سے مردوں کے کفن کو چرا کر پوری ہوتی ہیں۔ پہلے لوگ اپنے عزیزوں کو قبروں میں اتارتے تھے تو انھیں قیمتی کفن دیا کرتے تھے لیکن جیسے جیسے زمانہ تبدیل ہوتا گیا انسانی رشتوں اور قدروں کا زوال ہونا شروع ہو گیا، لوگوں نے قبروں کو پتھر کا بنانا شروع کیا لیکن اس میں مردوں کو باریک کفن دینے لگے جس سے مرُدہ برہنہ ہی رہتا ہے اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب لوگوں نے اپنے عزیزوں کو کفن دینا تو دور ان کے مُردہ جسم کو بھی غائب کرنا شروع کر دیا۔ اس کہانی کے ذریعہ افسانہ نگار یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ لوگوں میں کس طرح وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی قدروں کا زوال ہو رہا ہے۔ وہ دنیا کی رنگینیوں میں اس قدر کھو گیا ہے کہ ہر چمکتی شے کو پانا چاہتا ہے اور اسے ہی اپنی آرزوؤں کی تکمیل سمجھتا ہے۔ وہ صحرا میں چمکتی ہوئی ریت کو پانی سمجھ بیٹھا ہے اور اس کی طرف بار بار دوڑتا ہے، اس دوڑ میں وہ اتنی دور نکل چکا ہے کہ انسانی رشتوں اور اپنی تہذیب سے بہت دور ہو گیا ہے۔

چوتھی کہانی کا عنوان ''باغ کا دروازہ'' ہے اور اس مجموعے کا بھی عنوان ہے۔ اس کہانی کو افسانہ نگار نے داستانوی انداز میں بیان کیا ہے جہاں دادی نوروز کو کہانی کے ذریعہ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت سے روبرو کراتی ہیں۔ باغ اور اس کا دروازہ علامت کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں، ہندوستان ایک باغ کی مانند صدیوں سے چلی آ رہی تہذیب، مختلف قصّوں، نسلوں اور انسانی رشتوں کا گہوارہ رہا ہے۔ ہندوستان میں ہر مذہب، ہر تہذیب اور ہر نسل کے لوگ آتے تھے اور ایک دوسرے سے گھل مل جاتے تھے، کسی کی آمد پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی جس سے ہندوستان کی مٹی سرسبز ہو جاتی تھی۔

> ''شہزادی گلشن آرا نے حکم نامہ جاری کیا کہ یہاں ایک ایسا باغ لگایا جائے جس میں دنیا بھر کے نایاب و نادر پھول، طرح طرح کے پھل اور بے شمار خوبصورت درخت ہوں۔ باغ کی چہار دیواری ایسی ہو کہ جس میں ہزار دروازے ہوں اور سارے دروازے سبھی کے لیے کھلے رہیں ....... کچھ آنے والے کوہ قاف کو عبور کر کے آئے تو کچھ سمندر کے راستے۔ دور دور تک اس گل کدے کی شہرت تھی۔ لوگوں کی آمد کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ اب گل داؤدی، گلِ رعنا اور گلِ آفتاب کے ساتھ ساتھ کرسمس ٹری، پام کے درخت اور منی پلانٹ کے بیلیں بھی اس چمن زار میں دکھائی دینے لگی تھیں''

(طارق چھتاری، باغ کا دروازہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، اگست 2011، ص 47)

یہاں صاف طور پر ہندوستان میں مغلوں، ترکوں اور پھر انگریزوں کی آمد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آہستہ آہستہ ہندوستان میں فسادات شروع ہونے لگے، ایک خاص طبقہ دوسرے طبقے کو اکھاڑ پھینکنے کی طاق میں سرگرداں رہنے لگا۔

> ''باغ کی صفائی کے نام پر خودرو گھاس، سمجھ کر ان لوگوں نے سب پودے اکھاڑ پھینکے'' (ایضاً، ص 49)

> '' بے کار اور بے میل پودے اکھاڑ پھینکو۔ برگد کی صف میں برگد اور پیپل کی صف میں پیپل۔ پاکھن، چیڑ، ساکھو اور بس.....'' (ایضاً، ص 49)

> ''باہر سے کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوگی......'' (ایضاً، ص 48)

> ''چہار دیواری کے باہر سے لائے ہوئے پودے لگا کر باغ کی فضا کو آلودہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی ''

(ایضاً، ص 48)

اس طرح کی ذہنی کیفیت کو دور کرنے اور بغاوت کو ختم کرنے کا طریقہ بھی افسانہ نگار نے خوبصورت انداز میں بیان کردیا ہے کہ ہندوستان کی حفاظت خون بہا کر نہیں بلکہ عقل اور علم کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔

''نوروز نے دونوں چیزوں کو دیکھا۔ ان میں نہ کوئی چاقو تھا اور نہ مرچوں کی شیشی۔ اس نے پھر غور سے دیکھا اور سیاہ مگر روشن رقیق سے لبریز شیشی کی ڈھکن کو کھولا اور تیز دھار والی چیز کے ایک سرے کو داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور دو انگلیوں کے پوروں کے درمیان دبا کر شیشی میں ڈبو دیا۔ ایسا کرتے ہی اس کے چہرے سے دانش وری کی شعاعیں پھوٹنے لگیں اور باغ کی فصیل پر ایک تحریر ابھر آئی۔''

(ایضاً،ص51)

آہستہ آہستہ یہ باغ اجڑ رہا ہے لوگوں کے اندر سے تہذیب و ثقافت کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ مغربی کلچر کی آمد نے پرانی تہذیب کو بدل دیا ہے، انسانوں نے اپنی پرانی قدروں سے دور ہونے کے باعث نئی طرزِ زندگی اور تہذیب کو اپنا لیا ہے اور اس طرح وہ اپنی اصل پہچان کو بھولنے لگے ہیں۔

پانچواں افسانہ ''گلوب'' ہے یہ ایک نفسیاتی اور جنسی استحصال کی کہانی ہے، جہاں عورت، پجاری اور مالک تینوں نوکر لڑکے کا استعمال کرتے ہیں۔ عورت لڑکے کو اپنی مرضی کے مطابق چھونے کا حکم دیتی ہے لیکن لڑکا جب اپنی مرضی سے اسے چھونے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اسے مارتی پیٹتی ہے۔ اس طرح اس کہانی کے ذریعہ افسانہ نگار نے عورت کو دنیا کی علامت بنا کر پیش کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس دنیا میں انسان کو اپنی مرضی کے مطابق سب کچھ نہیں ملتا بلکہ اسے اس کی مرضی کے بغیر اس دنیا میں اپنا کردار نبھانا ہوتا ہے۔ انسان اتنا لاچار اور بے بس ہے کہ وہ ظلم و تشدد کو برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

''نیم پلیٹ'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ایک ایسے بوڑھے انسان کیدار ناتھ کا بیان کیا گیا ہے جو اپنی بیوی کا نام بھول جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنا اور اپنے دوستوں کا نام بھی بھولنے لگتا ہے، اس طرح وہ ایک ذہنی خلفشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ آخر میں اسے اپنا نام یاد آجاتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ اس افسانے کے ذریعہ طارق چھتاری نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تنہائی کا غم کتنا بڑا غم ہوتا ہے، انسان کی اپنے وجود کو کھو جانے کے بعد کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اس دنیا کی رنگینیاں اور رعنائیاں انسان کی اپنی ذات سے وابستہ ہیں، نئی نسل کے لوگوں سے اس بات کی امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی پرانی نسل کے لوگوں کے لیے وقت نکالیں یا ان کی پہچان کو بچائے رکھنے کی سعی کریں۔ ایسی صورت میں انسان اپنی تنہائی سے گھبرا جاتا ہے اور اپنی ذات کے کھو جانے کے غم میں غمگین ہوتا رہتا ہے۔

طویل عمر میں کسی بات کا بھولنا ایک عام بات ہے لیکن اپنی اس بیوی کا نام بھول جانا جو عمر بھر اس کے ساتھ رہی ہو، جو زندگی کا حصّہ رہی ہو، یہاں تک کہ خود اس کی ذات کا حصّہ ہو یہ بے حد چونکا دینے والا عمل ہے کیونکہ یہاں بات صرف اپنی بیوی کے نام کی گمشدگی کی نہیں بلکہ اس کی اپنی شناخت کی بھی گمشدگی ہے۔ بیوی کا نام یاد نہ ہونا بلکہ بیٹی اور داماد کا نام یاد ہونا اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ آنے والی نسلوں نے پرانی نسلوں کو بھلا دیا جس کی وجہ سے پرانی نسلوں کے وجود کی شناخت مشکل ہو گئی ہے۔ کیدار ناتھ کو اپنی شادی یاد ہے، یہ بھی یاد ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی صرف تین سال کے عرصے تک محدود تھی۔ ان کے علاقے کا نام کیلاش نگر ہے، ان کے دوست کا نام ست پرکاش شرما ہے یہاں تک کہ ان کی اپنی ماں کا نام پاروتی دیوی ہے ان کی ان سبھی باتوں سے واقفیت ہے۔

''پاروتی دیوی.......'' ان کی ماں کا نام پاروتی دیوی تھا۔ انھیں بہتر سال کی عمر میں بھی اپنی ماں کا نام یاد ہے۔''
''پاروتی دیوی کی جے......'' بچپن میں وہ اپنے بابا کے ساتھ بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔ ''بابا.... اماں کا نام بھی تو پاروتی دیوی ہے۔'' ''ہاں بیٹے پاروتی دیوی ہیں جن کے نام پر تمھاری اماں کا نام رکھا گیا ہے'' (ایضاً،ص62)

یہ چند سطور اس بات کا ثبوت ہیں کہ کیدار ناتھ خود اپنی پرانی قدروں سے جڑے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اس کی شناخت کرنے پر عبور رکھتے ہیں لیکن جب بات بیوی کی آتی ہے تو وہ اس کا نام بھول جاتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی شناخت کو بھول بیٹھے ہیں۔

''رام پرکاش..... نہیں ان کا نام تو ست پرکاش تھا۔''
''اچھا تو اب باپ کے نام کی پلیٹ اکھاڑ کر......'' کھٹ سے کوئی چیز گری۔ انہیں لگا کہ ان کے ذہن سے کوئی چیز نکل کر قدموں میں آن گری ہے۔ وہ سہم گئے اور مجرم کی طرح گردن جھکالی۔ یہ کسی کی نام کی پلیٹ تھی۔ مگر ایک حرف بھی صاف نہیں۔ سب کچھ مٹ چکا ہے'' (ایضاً،ص61)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نیم پلیٹ کا گرنا اس بات کی علامت ہے کہ پرانی قدروں کا زوال ہونے لگا ہے اور اس کی جگہ نئی قدروں نے

لے لی ہے۔

''بابوجی اتنے سویرے؟ سب ٹھیک ہے نا۔''

''میرے جلدی آنے پر یہ لوگ اتنا زور کیوں دے رہے ہیں۔ضرور میرے اچانک آنے سے یہ سب ڈسٹرب ہوئے ہوں گے۔مجھے چلے جانا چاہیے،ابھی....''

''بابوجی ابھی کچھ کام کے سلسلے میں آپ کہہ رہے تھے......''

''کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں جلدی سے کام بتا کر چلتا بنوں تا کہ ان کے پروگرام ڈسٹرب نہ ہوں۔''

''کیا یہ لوگ آج میرے لیے اپنے پروگرام نہیں چھوڑ سکتے؟''(ایضاً،ص63-64)

یہ سطور اس بات کی طرف ذہن کو بار بار لے جاتی ہے کہ پرانی قدروں کو اس بات کا احساس ہے کہ نئی نسل کو انھیں دینے کے لیے وقت ہی نہیں ہے یعنی ان کی اپنی ذات کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔اس افسانے کا اختتام یوں بھی ہوسکتا تھا کہ کیدار ناتھ صاف طور پر اپنی بیٹی سے اس کی ماں کا نام پوچھ لیتے اور وہ بتا دیتی لیکن افسانہ نگار نے ایسا نہیں کیا بلکہ انھوں نے کیدار ناتھ کی ذہنی کشمکش کو بڑے خوبصورت اور واضح انداز میں بیان کیا ہے کہ بیٹی کیا سوچے گی کہ وہ اپنی بیوی کا نام بھول گئے۔

''کیا سمجھے گی؟ یہ کہ میں اپنی بیوی کا نام بھول گیا ہوں اور رات بھر جاگتا رہا ہوں یا یہ کہ میں رو رہا ہوں''(ایضاً،ص64)

یہاں وہ بیوی کی جگہ سرلا کی ماں کا لفظ بھی استعمال کرسکتے تھے لیکن یہاں بیوی علامت ہے اپنی ذات کی،اپنی پرچھائی کی،اپنی پہچان کی اور self identification کی۔رات بھر جاگنا اور رونے کی کیفیت صرف اس اضطراب میں ممکن ہے جو ہماری ذات سے جڑا ہوتا ہے۔جیسے ہی انھیں اپنا نام یاد آتا ہے وہ گہری اور پرسکون نیند سو جاتے ہیں۔

''اپنی بیٹی،دوست کا،اس پارک کا اور اپنی بیوی کا نام۔۔۔۔کیدار ناتھ!محسوس ہوا کہ ساری دنیا کا نام کیدار ناتھ ہے''۔

''صبح ہوئی تو انھوں نے خود کو بہت مطمئن محسوس کیا۔رات بہت گہری اور پرسکون نیند آئی تھی''۔(ایضاً،ص70)

اپنی شناخت کی گمشدگی اور اپنے وجود کی پہچان ہی اس افسانہ کا اصل موضوع ہے۔

''شیشے کی کرچیں'' محبت اور جذبات سے بھرا ہوا افسانہ ہے جہاں ایک مریض اور ایک ڈاکٹر کی محبت کا بیان کیا گیا ہے۔دونوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے پھر بھی وہ دونوں محبت کے ان انجانے راستوں پر چلنے لگتے ہیں جہاں شیشے کی کرچیاں ہی ان کی ہمسفر بنتی ہیں اور ان کی روح زخمی ہو جاتی ہے۔

''وہ شیشے کی کرچوں کو نہیں اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹ رہا ہو''۔(ایضاً،ص72)

یہ ایک عام محبت کی کہانی ہے جس میں کسی خاص مقصد کو بیان نہیں کیا گیا ہے۔

''آدھی سیڑھیاں'' ایک زوال آمادہ مسلم معاشرے کی کہانی ہے جہاں سعیدہ بیگم ایک زمیندارانہ نظام کی پروردہ ہیں اور اپنے بیٹے کی شادی پوری شان وشوکت کے ساتھ کرنا چاہتی ہیں جس کی وجہ سے انھیں اپنے گاؤں کی زمینوں کو بیچنے کی نوبت آجاتی ہے لیکن پھر بھی تہذیبی رکھ رکھاؤ اور اپنی جھوٹی شان وشوکت کی نمائش کے لیے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔اس افسانے کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ مسلم معاشرہ زوال آمادہ ہے بلکہ اس کے ساتھ بہت سے ایسے مسائل بھی ہیں جن کی طرف افسانہ نگار قاری کا ذہن مبذول کرانا چاہتا ہے۔جیسے زمیندارانہ نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی لالا دیوی سرن جیسے ساہوکاروں کا نزول،ساہوکاروں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بننا،ان کی مفاد پرستی،گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت،تہذیبی رکھ رکھاؤ اور جھوٹی شان وشوکت کے لیے خاندانی جائداد کو بیچ دینا اور ماضی کی یاد کو سینے سے لگا کر ذہنی کرب میں مبتلا ہونا۔

''احمد نے سامنے دیکھا،دور تالاب کے اس پار اس کے اپنے ہرے ہرے کھیت لہلہا رہے تھے اس نے آنکھیں بند کرلیں اور جب کھولیں تو محسوس ہوا کہ صدیاں بیت گئی ہیں۔اب بازی پلٹ گئی تھی۔زمین پر بکھری ہری گولیاں غائب تھیں اور لال گولیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔سورج کی کرنیں زمین پر اتر آئی تھیں اور کانچ کی لال گولیوں پر اس طرح پڑ رہی تھیں کہ اس کے کھیت اب سرخ نظر آرہے تھے''

(ایضاً،ص99-100)

افسانہ نگار بڑے واضح انداز میں بیان کرنا چاہتا ہے کہ ماضی میں جو چیز ہماری پہچان تھیں، وہ کس قدر زوال کی طرف رونما ہو رہی ہے۔ روپیہ نہ ہونے کی صورت میں تہذیبی رکھ رکھاؤ اور جھوٹی شان وشوکت بری طرح لوگوں کی ذہنیت پر حاوی ہے۔

''نہیں احمد،ہمیں بارات لے کر دوسرے کی دہلیز پر جانا ہے۔اپنی نہیں تو اپنے ابا حضور کی عزت کا تو خیال کرو،اگر

شادی دھوم دھام سے نہیں ہوئی تو بستی والے کیا کہیں گے۔‘‘

(ایضاً،ص104)

احمد کی شادی کی تقریب میں جس طرح سے خرچ اور جھوٹی شان و شوکت کا دکھاوا کیا جاتا ہے اس کے بعد تو وہ وقت آنا ہی تھا جب بڑے گھر سے نکل کر چھوٹے اور کرائے کے مکان میں منتقل ہونا پڑتا ہے۔

’’اب اس عمر میں اجنبی پودوں سے کہاں تک مانوس ہوا جائے‘‘ (ایضاً،ص107)

یہ سعیدہ بیگم کی اس ذہنی کرب کی علامت ہے کہ جس تہذیب اور زندگی کو وہ ماضی میں گزار چکی ہیں وہ اسی کی عادی ہو چکی ہیں۔ اب وہ کیسے اپنی تہذیب بھول جائے؟ کیسے نئے معاشرے کے نئے تقاضوں کو پورا کریں اور ایک نیا لبادہ اپنے اوپر ڈال لیں۔ جو شے انسان کے وجود کا حصہ بن جاتی ہے اسے وہ اتنی آسانی سے ترک نہیں کر سکتا اور وہ گھٹن کا شکار ہو جاتا ہے جس طرح سعیدہ بیگم اپنے پرانے گھر کو چھوڑ کر چھوٹے سے کرائے کے مکان میں گھٹن محسوس کرتی ہیں اور اداس رہنے لگتی ہیں لیکن جیسے ہی اپنی ڈیوڑھی پر پہنچتی ہیں پھر سے جی اٹھتی ہیں۔ لیکن وقت کو تو گزر ہی جانا ہے اور اس طرح واپس شہر لوٹنے کا وقت آ جاتا ہے۔

’’وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے صحن کو پار کر کے باغیچے میں لگے شہتوت کے قریب پہنچیں پانی سے بھری بالٹی اٹھائی اور شہتوت کے پیڑ میں انڈیل دی۔ وہاں سے لوٹ کر صدر دروازے تک آئیں۔ نقش ونگار والے برسوں پرانے موٹے کواڑ چھوئے، پھر دالان میں لگی لالٹین اتار کر زینے کی طرف مڑیں اور سیڑھیاں چڑھنے لگیں مگر آدھی سیڑھیوں تک ہی پہنچی ہوں گی کہ جانے کیا سوچ کر واپس اتر آئیں‘‘

(ایضاً،ص110)

اس سے اس ذہنی کرب کا پتہ چلتا ہے جو ایک زوال آمادہ معاشرے کو بے چین کرتا ہے۔ جس نے آدھی سے بھی زیادہ زندگی اپنی تہذیب کے رکھ رکھاؤ میں لگا دی ہو وہ باقی زندگی بیوہ کی سونی مانگ کی طرح کیسے گزارے؟ یہی کرب ہے اور یہی کشمکش ہے جو سعیدہ بیگم کو آدھی سیڑھیوں تک ہی پہنچنے دیتا ہے کیونکہ اب مزید آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ اب واپسی طے ہے یعنی عروج کے بعد زوال مقدر ہے۔

’’پورٹریٹ‘‘ ایک ایسے آرٹسٹ کی کہانی ہے جو ایک فقیر کی پینٹنگ بناتا ہے جسے لوگ اونچے داموں پر تو خرید لیتے ہیں لیکن اس فقیر کو ایک روپیہ بھی دینا نہیں چاہتے۔ اس فقیر کی تصویر کو ڈرائنگ روم میں لگا کر ہر آنے والوں کی داد تو چاہتے ہیں لیکن حقیقت میں اس فقیر سے محبت کا کوئی جذبہ نہیں رکھتے۔ افسانہ نگار اس کہانی کے ذریعہ لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ لوگ کس طرح حقیقت سے نظریں چرا کر جھوٹ اور دکھاوے کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ فقیر سے نفرت کا اظہار اور اس کی ہی تصویر سے حد درجہ خوشی انسانیت اور حقیقت کے زوال کی طرف اشارہ ہے۔

’’صبح کاذب‘‘ دو نسلوں کے بیچ جنریشن گیپ کی کہانی ہے، اس کہانی میں استحصال کے طریقے تبدیل ہو چکے ہیں۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ظلم کون کس طرح سے کر رہا ہے۔ اس کے اہم کردار امی چند، رائے چند، چوکھے لال اور پردھان جی ہیں۔

’’تین سال‘‘ ایک ایسا افسانہ ہے، جس میں علی جان کے اوپر بیگم مرزا کے گھر چوری کرنے کا الزام لگتا ہے اور اسے تین سال کی سزا ہوتی ہے۔ بیگم مرزا کو علی جان سے نفرت محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کے لیے ممتا اور ہمدردی کے جذبے سے سرشار نظر آتی ہیں۔ یہ کہانی ذہنی الجھن و کشمکش کی کہانی ہے۔

’’کوئی اور‘‘ اس کہانی کا موضوع رقابت اور جلن ہے جس میں شوہر اپنی بیوی کے پہلے شوہر جس کی موت ہو چکی ہے اس سے رقابت کا جذبہ محسوس کرتا ہے۔ وہ پوری کہانی میں ایک نفسیاتی کشمکش کا شکار ہے۔

’’دس بیگھے کھیت‘‘ طارق چھتاری کا ایک عمدہ افسانہ ہے۔ آزادی کے بعد چکبندی کی پالیسی نافذ ہونے سے غریبوں کو تو کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ اس کا فائدہ امیروں نے بھرپور طریقے سے اٹھایا۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے چھدّا چمار کی زندگی کو ایک مثال کے طور پر بیان کیا ہے۔

’’ژ مبان‘‘ ذہنی کشمکش اور نفسیاتی دباؤ کی کہانی ہے۔

’’دوسرا حادثہ‘‘ اس افسانے میں افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کے لیے سب سے پہلے اس کی اپنی ذات کی اہمیت ہے۔ یہ ایک نفسیاتی کشمکش اور ذہنی تصادم کی کہانی ہے جہاں دیالو جاٹ اپنے گاڑی سے اتر کر اپنی مری ہوئی ماں کو دیکھنے صرف اس لیے نہیں جاتا تاکہ اس کی جان بچ جائے۔

’’برف اور پانی‘‘ ایک رومانی کہانی ہے جس میں محبت اور جنس کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

’’چھلاوا اور وہ‘‘ نیکی اور بدی کی کہانی ہے جہاں شعور اور لاشعور کی جنگ کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح نیکی بدی پر حاوی ہونے کے باوجود بھی نیک انسان ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔

’’چابیاں‘‘ مکمل طور پر ایک علامتی افسانہ ہے جہاں یہ بتانے کی

کوشش کی گئی ہے کہ انسان اپنی عقل اور محنت کے ذریعہ ہی کامیابی تک پہنچ سکتا ہے۔زیادہ سے زیادہ پالینے کی ہوس نے اسے بے چین کر رکھا ہے اور وہ اس لاحاصل شے کی تلاش میں زندگی بھر بھاگتا رہتا ہے جو اسے کبھی نہیں ملتی لیکن اسے افسوس تب ہوتا ہے جب وہ اپنی آنے والی نسل کو بھی مغرب کی چکاچوندھ کر دینے والی روشنی کی طرف بھاگتے دیکھتا ہے۔

''بندوق'' بھی ''لکیر'' کی طرح فرقہ وارانہ فسادات پر لکھی گئی ہے لیکن اس افسانے کا کمال یہ ہے کہ بغیر کسی خونی حادثے کا ذکر کیے افسانے میں اس موضوع کو پیش کیا گیا ہے یہ افسانہ نگار کی فنی ہنرمندی کی عمدہ مثال ہے۔شیخ سلیم الدین جیسے کرداروں کی وجہ سے فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والوں کے ذہن تبدیل ہو جاتے ہیں اور امن و شانتی کے منتظر نظر آتے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ طارق چھتاری کے افسانے اردو ادب میں ایک متوازی اور مستند نظریہ کی راہ ہموار کرتے ہیں ۔انھیں اردو کی افسانوی تاریخ میں ایک بلند مقام حاصل ہے جس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صغیر افراہیم لکھتے ہیں۔

> ''طارق چھتاری کی کہانیاں تھیم اور برتاؤ کے اعتبار سے اپنی ایک الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہوئی ہیں اور اس کامیابی کی بڑی وجہ ان کا ساحرانہ اندازِ بیان ہے جو ابتداء سے اختتام تک قاری کو باندھے رکھتا ہے''

(صغیر افراہیم، طارق چھتاری کا افسانوی سفر، طارق چھتاری گنجینۂ معنی کا طلسم، مرتب، ڈاکٹر حامد رضا صدیقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-6، 2018، ص-235)

طارق چھتاری کو ایک کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ایسا بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے کہ کسی افسانہ نگار نے صرف ایک ہی مجموعے کو لکھ کر اتنی شہرت و مقبولیت حاصل کی ہو۔اس کی ایک ہی وجہ ہوتی ہے کہ لکھنے والے نے اپنی تمام فنی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے اپنے دل کی گہرائیوں سے افسانے کو لکھا ہے۔آخر طارق چھتاری کے افسانوں میں ایسی کیا بات ہے جو انھیں اپنے ہم عصروں سے مختلف اور بلند مقام عطا کرتی ہے۔

علامتی افسانے اپنے آپ میں اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ قاری کو سمجھنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن طارق چھتاری کے افسانوں کو پڑھ کر ذہن کی گتھیاں سلجھتی ہوئی سی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ انھوں نے صرف علامتوں کے ذریعہ مسائل سے روبرو ہی نہیں کرایا بلکہ اشاروں اور علامتوں کے ذریعہ ان کے حل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ان کے فن کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ وہ تفصیلات کو بیان کرتے وقت ایک دوسرے سے مربوط کرتے جاتے ہیں جس سے کہانی کا کوئی سرا چھوٹنے نہیں پاتا اور قاری یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس واقعہ میں یہی مرحلہ پیش ہونا چاہیے تھا۔ان کا بیانیہ انداز ساحرانہ ہے جو ابتدا سے اختتام تک قاری کو اپنی گرفت میں لیے رہتا ہے۔

منظر نگاری کی عمدہ مثالیں ان کے افسانوں کی شان ہے۔مختصر الفاظ کے مناسب استعمال سے اختصار اور جامعیت کو قائم رکھا ہے۔آدھی بات میں ہی اپنے قلم کی جنبش کو روک لینا جس سے قاری کو پوری بات سمجھ میں آجائے ایک ایسا طریقہ ہے جو افسانہ نگار کی فن پر مضبوط پکڑ کو ظاہر کرتا ہے۔ان کے یہاں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔انسانی نفسیات کی باریکیوں سے اچھی طرح واقف ہیں اور کردار کے ایک ایک عمل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ان کے افسانوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انھوں نے معاشرے اور انسانی فرد کی زندگی کا کوئی بھی معاملہ ایسا نہیں ہے جس کو ادھورا چھوڑ دیا ہو۔انسان کے ذہنی کرب، بے چینی، بے اطمینانی، اس کی نفسیاتی کیفیت، شعور و لاشعور کی جنگ، لوگوں کے ذریعہ انسانیت کا خون، فسادات، ملک کے اندر بے چینی، محبت اور جنس، ماڈرن زندگی کا کھوکھلاپن، قدروں کا زوال، استحصال، ہندوستان کی تہذیب، شناخت کی گمشدگی، نسلوں کے بیچ کا جنریشن گیپ، آزادی کے بعد کسانوں کی بدحالی، رسم و رواج کی آڑ میں معصوموں کا استحصال اور نیکی اور بدی کی جنگ جیسے نہ جانے کتنے ہی مسائل کو انھوں نے اپنے افسانے کا موضوع بنایا اور اسے خوبصورت انداز میں پیش بھی کیا۔ایسے مسائل پر لکھنے والے افسانہ نگار کے پاس لکھنے کی ایک الگ تکنیک ہوتی ہے جو اسے دوسروں سے منفرد حیثیت دلانے میں مدد کرتی ہے۔ان کی منظر نگاری کچھ اس طریقے کی ہے جو دورِ حاضر کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے۔

ان کے یہاں نادر تشبیہوں کا حسین امتزاج ملتا ہے جس سے ان کے افسانوں کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔زبان کی صفائی اور سادگی اور اسلوب کی تازگی ان کو معاصر افسانہ نگاروں میں ممتاز بناتی ہے۔

❑❑❑

**Sheeba Parveen**
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

امام الدین

# خواتین میں تعلیمی خودانحصاری کے رجحانات

زمانہ قدیم سے ہی ہمارا ملک تعلیم وتربیت کے معاملے میں خود انحصار اور خودکفیل رہا ہے۔لیکن تعلیمی خودکفالت اور خودانحصاریت بہت حد تک لڑکوں اور مردوں تک ہی محدود رہی ہے۔قدیم ہندوستان کی تاریخ و ثقافت کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ زمانہ قدیم میں ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم بہت محدود تھی۔مسلمانوں کی آمد کے بعد تعلیمی میدان میں مزید ترقی ہوئی لیکن پھر بھی لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کا گراف لڑکوں اور مردوں کے تعلیمی گراف سے بہت نیچے ہی رہا۔کچھ سیاح اور مورخین جنھوں نے عہدوسطی میں ہندوستان کی تعلیمی،سماجی اور معاشی صورت حال کا جائزہ لیا ہے نے لڑکیوں کے مدارس کی تفصیل بتائی ہے مگر وہ تصویر پورے ہندوستان کی تصویر نہیں کہی جاسکتی ۔ہاں مگر مغل دور میں بہت سی خواتین کے تعلیمی اختصاص کا پختہ ثبوت ملتا ہے لیکن وہ عوامی نہیں بلکہ امرا،روسا اور حاکم وقت کی لڑکیوں اور عورتوں سے متعلق ہے۔1857 کے بعد ہندوستان کی تعلیمی صورت حال میں تبدیلی آئی، ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور برطانوی حکومت کے براہ راست تسلط نے یہاں کی تعلیمی صورت حال تبدیل کردی۔تاہم یہ تبدیلی لڑکوں اور مردوں کی تعلیم میں ہی نمایاں نظر آتی ہے۔ہاں مگر اسی دور سے لڑکیوں کی تعلیم کے تئیں سماجی رجحانات میں مثبت تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔مسلمان جنھوں نے اپنی حکومت انگریزوں کے ہاتھ گنوائی تھی کا مجموعی تعلیمی گراف بھی نیچے ہوگیا۔عورتوں کی تعلیم کا گراف نہایت افسوسناک حد تک نیچے تھا۔تعلیمی اور سماجی اصلاحات کے لیے بہت سے ادارے اور افراد نے انتھک کوششیں کیں جس میں مصلح قوم وملت سرسید احمد خان کا نام سنہرے حروف میں لکھا جاسکتا ہے۔تاہم خود سرسید اور ان کے رفقائے کار کئی دہائیوں تک تعلیم نسواں کے تئیں تذبذب کا شکار رہے۔حالاں کہ بعد میں اس طرف خاطر خواہ توجہ کی گئی اور جا بجا لڑکیوں کے مدارس اور اسکول کا الگ سے انتظام کیا جانے لگا۔لیکن اب بھی لڑکیوں کی تعلیمی ترقی لڑکوں کے تعلیمی ترقی کے مقابلے میں بہت ہی نیچے تھی۔خواہ مسلمان ہوں یا ہندو معاشرتی اور مذہبی رجعت پسندی کی وجہ سے Co-education کے لیے تیار نہ تھے۔

اعدادوشمار بتاتے ہیں کہ آزادی سے قبل 1941 کی مردم شماری میں لڑکیوں کی خواندگی کی شرح صرف 6 فیصد تھی جو لڑکوں کی خواندگی کی شرح 23 فیصد کے مقابلے نہایت کم تھی۔لڑکیوں کی اس خواندگی کا زیادہ تر حصہ شہروں سے ہی تعلق رکھتا تھا۔دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم کا تناسب افسوسناک حد تک نیچے تھا۔آزادی کے بعد تعلیم پر خصوصی توجہ صرف کی گئی اور تعلیم سے متعلق جو بھی منصوبے، پالیسیاں اور کمیشن بنائے گئے ان میں لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ صرف کی گئی۔چنانچہ سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن (مدالیار کمیشن 1952-53 )، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (UGC195)،قومی تعلیمی کمیشن (کوٹھاری کمیشن 1964-66 )، نیشنل ایجوکیشنل پالیسی 1968، قومی تعلیمی پالیسی 1986، پروگرام آف ایکشن 1991-92 اور سروشکشا ابھیان وغیرہ میں خصوصی توجہ لڑکیوں کی تعلیم اور خواتین کو خودانحصار بنانے کی طرف کی گئی۔ان کوششوں کے خوشگوار نتیجے کے طور پر پچھلی صدی کی آخری دہائی میں ملک میں لڑکیوں اور

عورتوں کی تعلیم کا گراف آگے بڑھا اور 2001 کی مردم شماری کے مطابق لڑکیوں کی شرح خواندگی 54.16 ہوگئی جبکہ 1991 کی شرح خواندگی 39.32 سے 14.32 فیصد زیادہ تھا۔ ظاہر ہے ان دس سالوں میں خواتین کی شرح خواندگی میں خوش آئند اضافہ ہوا۔ 2011 کی مجموعی شرح خواندگی کے مطابق لڑکیوں کی شرح خواندگی کا تناسب 65.46 ہے۔ یہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ لڑکیوں/عورتوں کی تعلیم میں بہتری آئی ہے تاہم 2011 کی مجموعی شرح خواندگی 74.04 کے مقابلے اب بھی بہت کم ہے۔ اس کمی کی کئی معاشی و سماجی اور مذہبی وجوہات ہیں۔ مثلاً سماج کے ایک بڑے طبقے میں لڑکیوں کے مقابلے لڑکوں کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت پر زیادہ توجہ دینا Male Child کی خواہش، صنفی تعصب، جنسی استحصال اور چھوٹی عمر میں بچیوں کی شادی بھی تعلیمی طور پر پسماندگی کی اہم وجوہات ہیں۔

ہندوستان میں تعلیم نسواں کی پسماندگی کی مذکورہ وجوہات کے علاوہ بھی کئی معاشی و معاشرتی رکاوٹیں ہیں جن کی وجہ سے لڑکیوں کی ترک تعلیم Drop-out کی شرح لڑکوں کے مقابلے بہت زیادہ ہے۔ Drop-out کی شرح کا زیادہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارا سماج ابھی بھی قدامت پسندی کا شکار ہے۔ کئی خاندانوں میں بچیوں کے سن بلوغ یا Adolscence کی عمر تک پہنچتے ہی انھیں ترک تعلیم پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ گھریلو ذمہ داریاں، پردہ سسٹم Separate Girls Schools کی کمی، گھر سے تعلیمی اداروں کی دوری اور مخلوط اسکول Co-education میں صنفی تعصب اور جنسی ہراسانی کی وجوہات بھی لڑکیوں/عورتوں کی تعلیم میں حائل رکاوٹیں ہیں۔ ان ساری پریشانیوں اور رکاوٹوں کے باوجود تعلیم و تربیت کے شعبے کے علاوہ معاشرتی، معاشی اور اقتصادی سبھی سطح سے گزرتے ہوئے ہر دن کے ساتھ لڑکیوں اور عورتوں کی ترقی کی شرح تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں خواتین نے اپنی ترقی کا علم بلند کیا ہے اور اپنی ذہنی استعداد کا ثبوت پیش کیا ہے۔

تعلیم ہی ایک ایسی کلید ہے، جس سے باشعور زندگی گزارنے کے لیے ہر شعبہ ہائے زندگی کا تالا کھلتا ہے۔ چنانچہ تعلیمی طور پر خود انحصاری نے خواتین کو زندگی کے ہر شعبے میں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا ہے۔ تعلیمی خود انحصاری کی وجہ سے پنچایتی راج ہو یا دوسری شہری اکائیاں ہر جگہ خواتین کی خاطر خواہ نمائندگی دیکھنے کو مل رہی ہے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ تقریباً ہر ریاست میں پنچایتی سطح پر وارڈ ممبران، سرپنچ، مکھیا (گرام پردھان)، پرمکھ وغیرہ کی اچھی خاصی تعداد خواتین کی ہے۔ بچوں کی ابتدائی درجات کی تعلیم کے لیے عورتوں کو زیادہ موزوں اور مناسب سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں قوت برداشت زیادہ ہوتی ہے اور چھوٹے بچے خواتین سے زیادہ قربت پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قومی تعلیمی پالیسی 1986 کی کئی سفارشات اور شقوں میں بچوں کی تعلیم اور خواتین کی شمولیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

آپریشن بلیک بورڈ کے تحت جن اہم نکات کو پیش کیا گیا ہے ان میں پرائمری سطح پر کم سے کم دو اساتذہ والے اسکولوں میں ایک خاتون ٹیچر کو مقرر کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

مخلوط اسکولوں میں صنفی امتیازات اور جنسی ہراسانی کے معاملات پر قابو پانے کے لیے زیادہ سے زیادہ Lady Teachers کی تقرری کی ہدایت دی گئی ہے۔ Separate Girls Schools میں کسی مضمون میں جب کوئی خاتون ٹیچر دستیاب نہ ہوں تب ہی Gents Teachers کی تقرری کی بات کی گئی ہے۔ یہ سب ہدایات اور مراعات تعلیم میں لڑکیوں اور خواتین کی حوصلہ افزائی و خود مختاری کی طرف مثبت اقدامات ہیں۔

زندگی کے دوسرے شعبوں مثلاً میڈیا، کارپوریٹ، فلم انڈسٹری وغیرہ کے علاوہ ہومعالجے، دواسازی، جہازرانی، نشرواشاعت، گھریلو صنعتیں، چھوٹی صنعتوں، فیشن ڈیزائننگ، ملبوسات کی تیاری، کاسمیٹکس غرض کہ زندگی کے سبھی کارآمد شعبوں میں اب خواتین کی اچھی خاصی نمائندگی ہونے لگی ہے جو انھیں ایک طرف حوصلہ و ہمت بخشتا ہے، خود انحصار بناتا ہے تو دوسری طرف آنے والی نسلوں کے لیے راہیں بھی ہموار کرتا ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کا شعبہ مردوں کے غلبے والا شعبہ کہا جاتا ہے

تاہم اس شعبے میں بھی اب خواتین سائنسدانوں، انجینئرس وتکنیکی ماہرین بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کررہی ہیں۔ مثال کے طور پر اس فیلڈ میں سنیتا سرواگی، ودیتاودیہ، گنگ دیپ، فرح اشتیاق، دیوپریاچٹوپادھیائے، کالیکا بالی، ادیتی سین ڈی، متھیاونیتا اور ریتوکریدھال کے نام خصوصیت سے لیے جاسکتے ہیں۔ آزادی سے قبل اور اس کے بعد خواتین نے سیاسی میدان میں بھی اپنی ذہانت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ سیاسی میدان میں اپنی کارکردگی کا لوہا منوانے والی خواتین میں میڈم بھیکاجی کاما، اینی بسنٹ، اوشا مہتا، وجے لکشمی پنڈت، ارونا آصف علی، اندرا گاندھی، پرتیبھا دیوی سنگھ پاٹیل، جے للیتا، سشما سوراج، نجمہ ہپت اللہ، سمترا مہاجن، سونیا گاندھی، ممتا بنرجی، رابڑی دیوی، مایاوتی، محبوبہ مفتی، مینکا گاندھی اور کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔

معاشرتی زندگی کی بہترین عکاسی کرنے والا شعبہ فنون لطیفہ ہے جس میں فائن آرٹ، کلچر، ڈراما اور فلم ہے۔ صرف فلم کے شعبے میں اپنی بہترین اداکاری، پروڈیوسنگ اور ہدایت کاری کی چھاپ چھوڑنے والی خواتین کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ یہاں سبھی کا ذکر کرنا ناممکن ہے تاہم جن ہدایت کاروں، پروڈیوسروں اور اداکارہ خواتین نے اپنی کارکردگی سے آدھی آبادی کو حوصلہ بخشا ہے ان میں زبیدہ بیگم، دویکا رانی، نسیم بانو، نور جہاں، مینا کماری (مہ جبیں)، مدھوبالا (ممتاز جہاں بیگم دہلوی)، ثریا، زویا اختر، شانتا آپٹے، نرگس دت، پوجا بھٹ، فرح خان، سائرہ بانو، آشا پاریکھ، وحیدہ رحمٰن، ہیما مالنی، شبانہ اعظمی، لتا منگیشکر، اوشا منگیشکر، آشا بھوسلے، گیتا دت، ریکھا، ملائکہ اروڑا، جوہی چاولا، ایکتا کپور، گوری خان، شری دیوی، فرح خان اور میگھنا گلزار وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

مختلف زبانوں میں بہترین ادب کی تخلیق کرنے والوں میں بھی خواتین پیچھے نہیں ہیں۔ اس شعبے میں بھی خواتین نے اپنی علمی اور عملی کاوشوں سے آنے والی نسلوں کے لیے راہیں ہموار کی ہیں۔ سیکڑوں کی تعداد میں خواتین شعرا وادبا کے نام اس زمرے میں لیے جاسکتے ہیں۔ تاہم قرت العین حیدر، عصمت چغتائی، جیلانی بانو، پروین شاکر، اروندھتی رائے، انیتا دسائی، اندرا گوسوامی وغیرہ ایسی ادبی ہستیاں ہیں جن سے آنے والی نسلوں کی لڑکیاں وخواتین روشنی حاصل کرتی رہیں گی۔ سنیما اور ادب کے علاوہ مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے شعبے میں بھی خواتین نے خودمختاری اور خودانحصاری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ آزادی کے بعد انتظامیہ کے شعبے میں یونین پبلک سروس کمیشن کے باوقار مقابلہ جاتی امتحان پاس کرکے سماجی اور انتظامی زندگی میں ایسی سیکڑوں خواتین نے اپنے ہونے کا بین ثبوت پیش کیا ہے۔ اس شعبے میں فاطمہ بی بی، سوجاتا منوہر، روما پال، گیان سودھا مشرا، رنجنا دسائی، آریانو ماتھی، اندو ملہوترا، کرن بیدی اور اندرا بنرجی کے نام اہم ہیں۔

میڈیا کو جمہوریہ کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا شعبہ ہے جس کے ذریعہ شہریوں کے حقوق وفرائض کی بنیادیں مضبوط کی جاتی ہیں اور سیاست کی غلط پالیسیوں پر لگام لگائی جاسکتی ہے۔ یہ شعبہ کئی ذیلی شعبوں مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات ورسائل وغیرہ میں تقسیم ہے۔ فی زمانہ اس کے مثبت کردار میں کمی آئی ہے تاہم صحافت کے میدان میں سیکڑوں نہیں ہزاروں خواتین کے نام لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے صالح صحافتی

کردارادا کیے ہیں۔سبھی کا نام لینا یہاں ممکن نہیں۔

بین الاقوامی سطح پر ہو رہی سماجی، معاشی اور تعلیمی ترقی نے بھی ہندوستانی خواتین کو تعلیم کے تئیں بیدار ہونے اور اس کے ذریعے اپنے اندر خود انحصاری کا جذبہ پیدا کرنے کا شعور پیدا کیا ہے۔انفارمیشن ٹیکنالوجی کی بے بہا ترقی نے حصول تعلیم میں آسانیاں پیدا کی ہیں جس کا سیدھا اثر گھریلو خواتین پر پڑا ہے اور ان میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔بین الاقوامی سطح پر بعض ملکوں میں سیاسی، انتظامی، سماجی اور تعلیمی امور میں خواتین کی بڑھتی ہوئی حصے داری نے بھی ہندوستانی خواتین میں خود انحصاریت کی روح پھونک دی ہے۔غرض کہ دنیا کے Global village میں تبدیل ہونے کا خاطر خواہ فائدہ خواتین کو پہنچ رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں وہ شعبے بھی اب اچھوتے نہیں رہے جن میں خواتین کی نمائندگی یا تو تھی ہی نہیں یا نہیں کے برابر تھی۔جس کی مثال فوج، جہاز رانی، معاشیات کے شعبے، سائنسی تحقیق کے شعبے اور بینکنگ وغیرہ سے دی جا سکتی ہے۔اب ان شعبوں میں بھی خواتین کی خاطر خواہ شمولیت دیکھنے کو مل رہی ہے۔وہ دن دور نہیں جب زندگی کے ہر شعبے میں تعلیم کے ذریعہ خواتین کی خود انحصاری اور خود مختاری نمایاں ہوگی اور خواتین اپنے خاندان اور معاشرے کی ترقی کے ساتھ ساتھ ملک کی سماجی و معاشی ترقی میں بھی نمایاں کردارادا کریں گی۔

□□□

**Imamuddin**
Village- Ghorighat, Po. Kaura
Dist. Chatra
Jharkhand-825404
Mob:8651878577
Email:imammd318@gmail.com

## Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

## سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................بتاریخ.................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : .................................................................

پتہ : .................................................................

.................................................................

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

مسرت آرا

# اکیسویں صدی میں جموں و کشمیر کی خواتین افسانہ نگار

ہندستان کی جن ریاستوں نے اردو زبان وادب کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ کیا ان میں جموں و کشمیر کی حیثیت نمایاں ہے۔ ریاست جموں و کشمیر صدیوں سے صوفی، سنتوں، مہاتماؤں، دانشوروں، مفکروں اور ادیب وشاعر کی سرزمین رہی ہے۔ ریاست جموں و کشمیر اپنے قدرتی حسن، رعنائی اور فطرت کی جادوگری کی بدولت سارے عالم میں مشہور ہے، دنیا اسے جنت کے نام سے پکارتی ہے۔

جموں و کشمیر میں فکشن کی ایک مستحکم اور شاندار تاریخ رہی ہے بالخصوص فنِ افسانہ نگاری کی۔ جموں و کشمیر میں اردو افسانہ نگاری کا آغاز پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں سے ہوتا ہے۔ پردیسی پہلے کہانی کار تھے جنھوں نے ریاست میں اردو افسانے کو انسانی زندگی سے ہمکنار کیا اور اس میں نئے نئے رنگ بھر دیئے۔ ادبی تاریخ کا مطالعہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ جموں و کشمیر میں ایسے افسانہ نگار بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں جنھوں نے اس صنف میں قومی سطح کے ادبی منظر نامے پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں جن میں پریم ناتھ در، راما نند ساگر، موہن یاور، ٹھاکر پونچھی، کشمیری لال ذاکر، کرشن چندر، حامدی کاشمیری، نرسنگھ داس نرگس، برج پریمی، دیپک کول، نورشاہ، محمود بدخشی، رمیش کول، مالک رام آنند، شبنم قیوم، عمر مجید وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ جن خواتین افسانہ نگاروں کا قافلہ سامنے آیا ان میں شہزادی کلثوم، منظورہ اختر، زرینہ اختر، ڈاکٹر ترنم ریاض، نعیمہ احمد مہجور، سیدہ نسرین نقاش، زنفر کھوکھر، رابعہ دلشاد، نکہت فاروق نظر، نیلوفر ناز نحوی، واجدہ تبسم، ڈاکٹر نسیم جہاں، تبسم ضیاء، شبنم بنت رشید، فرحت آرا حیدری، ایم نساء،، نصرت چودھری، وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان خواتین افسانہ نگاروں نے مرد افسانہ نگاروں کے شانہ بہ شانہ چل کر ریاست میں اردو افسانہ نگاری کو ایک نئی سمت عطا کی۔ ہمارے فکشن نگار شروع سے ہی اردو کی تمام تحریکات اور رجحانات کا ساتھ دیتے رہے ہیں اور ہمیشہ عصری ضرورتوں کے پیش نظر فکشن تخلیق کرتے رہے ہیں، جن میں ریاست کی خواتین افسانہ نگار بھی کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ ہر دور کا ادب اپنے سماجی، معاشی اور سیاسی نظام اور اس سے پیدا ہونے والی مثبت ومنفی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے، یہ خوبی ریاست کی معاصر خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے انھوں نے آج کے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنا کر موثر افسانہ نگاری کا حق ادا کیا ہے، زیادہ تر خواتین نے روایتی عشق ومحبت کی داستانیں نیز سراسر تجریدی اور علامتی حکایتیں بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ انھوں نے بیانیہ انداز اختیار کر کے اپنی کہانیوں میں زندگی کے مختلف رنگوں کو فطری انداز میں ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے یہاں فنی اور موضوعاتی دونوں سطحوں پر نئی پرانی روایتوں کا حسین امتزاج اور کہانیوں کا نیا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔

جموں وکشمیر میں نسائی اردو افسانے کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ہوا۔جموں وکشمیر کے نسائی اردو افسانے کی تاریخ مختصر ہے۔یعنی جو خواتین افسانہ نگار بیسویں صدی میں سامنے آئی تھیں وہی اکیسویں صدی میں بھی موجود ہیں البتہ بہت کم ایسی خواتین ہیں جنھوں نے محض نئی صدی میں ہی افسانوی دنیا میں قدم رکھا ہو۔یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب اردو افسانے میں مابعد جدیدیت کا آغاز ہوا تو ریاست میں خواتین افسانہ نگاروں نے اسی دوران باقاعدگی سے قلم اٹھایا تھا۔مابعد جدیدیت نے فنکار کے پاؤں میں کبھی زنجیریں نہیں ڈالی بلکہ پوری آزادی دی۔مابعد جدیدیت کا یہ دور آج تک جاری ہے اس لیے خالص اکیسویں صدی کوئی الگ رجحان نہیں ہے۔ہم اکیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں کا مختصر جائزہ لیں گے۔

جموں وکشمیر میں خواتین اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں واجدہ تبسم گھور کو کا نام سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔واجدہ تبسم گھور کو سرینگر سے تعلق رکھتی ہیں،ان کی پیدائش 1952 کو سرینگر میں ہوئی۔ان کی ادبی زندگی کا سفر افسانہ نگاری سے شروع ہوا۔ان کی پہلی کہانی 'آہ کے اثر ہونے تک' روزنامہ چنار میں 1972 میں شائع ہوئی۔خواتین افسانہ نگاری کے حوالے سے اسی افسانے کو جموں وکشمیر کا پہلا افسانہ کہا گیا ہے۔مگر یہ افسانہ اب نایاب ہے۔واجدہ تبسم جس رفتار سے بیسویں صدی میں لکھ رہی تھیں اسی رفتار سے اکیسویں صدی میں بھی لکھ رہی ہیں۔

ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'ڈولتی نیا' کے عنوان سے 1983 میں شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ 'دل آج بھی روتا ہے' 2019 میں شائع ہوا، عورتوں کی دنیا،اس کی خوشیاں اور غم،عورتوں کے مسائل،اس کی محبت،اس کی ممتا،اس پر ہونے والے مظالم،اس کو مجبور کرنے والی باتیں اور اس کے سماجی وقار کی مکمل تصویر کشی واجدہ تبسم کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ایک عورت کا سب سے انمول لمحہ ماں بننے کا ہوتا ہے اپنے وجود سے ایک نئے وجود کی تخلیق ہی اس کی تکمیل کا سبب ہوتی ہے۔ان کا افسانہ 'ماں' اسی نوعیت کا افسانہ ہے جو عورت کی اس نفسیات کو قاری کے سامنے رکھتا ہے۔موصوفہ عورتوں کے ساتھ معاشرے میں جو ناانصافیاں ہورہی ہیں اس کے خلاف انھوں نے اپنے افسانوں میں آواز بلند کی ہے ان کی تحریروں میں ہمیں گھریلو ماحول اور معاشرے کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے ان کے افسانوں کا موضوع عورت ہے۔عورت کی عکاسی کرتے ہوئے وہ اپنے افسانے 'خوشبو کا سفر' میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''مگر آج کچھ شگفتہ، پرلطف، بامعنی اور موثر گفتگو میں اس کی ساری کلفتیں دھل گئیں۔وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔پھر سر اٹھا کر ایک نظر سلیم کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھا۔سلیم کچھ شرمندہ سا نظر آرہا تھا۔اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا کہ رضیہ کیا جواب دے گی مگر کچھ تھا جو وہ بولنا چاہتی تھی اور بول نہ پارہی تھی۔پھر بھی کوشش کی اور بول پڑی۔''

(خوشبوؤں کا سفر)

ان کا ایک افسانہ 'رنگ برنگے سپنے' بہت مشہور ہے، جس کو لوگ بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ان کے افسانے اخبار اور رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔زبان صاف اور سلیس ہے۔ان کا شمار جموں وکشمیر کی مشہور خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی سماجی، معاشی، اقتصادی اور انسانی زندگی کے مختلف رشتوں کی عکاسی بھی کی ہے۔ان کے افسانوں میں عورت مختلف روپ میں دکھائی دیتی ہے، کہیں وہ زمانہِ جہالت کی عورت ہے جو مرد کی بے جا زیادتیاں سہتے ہوئے بھی مرد کا احترام کرتی ہے اور ان کے مظالم کو برداشت کرلیتی ہے اس کی زندہ مثال ان کا افسانہ ''خواہشوں کا احترام'' ہے۔

اکیسویں صدی میں خواتین افسانہ نگاروں میں ترنم ریاض کا نام سرِفہرست ہے۔وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، شاعرہ، نقاد، محقق اور مترجم ہیں۔انھوں نے ادبی دنیا میں اپنی کاوشوں سے ایک منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ان کا شمار عالمی سطح کے مشہور معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ترنم ریاض کی پیدائش 19 اگست 1963 کو سرینگر کشمیر میں ہوئی۔ان کے والد کا نام چودھری اختر خان تھا۔ترنم ریاض کو بچپن سے ہی شاعری اور کہانیاں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔اپنی ادبی زندگی کے بارے میں ترنم ریاض خود کہتی ہیں:

''اس وقت کشمیر میں خواتین کو پڑھانے کا ماحول بالکل نہیں تھا اور یہاں کے لوگ عورتوں کو گھر کی چاردیواری میں ہی بند رکھتے تھے۔لڑکیاں شعروشاعری کریں یہ بات لوگوں کو بالکل ہی گوارہ نہ تھی لیکن میرے والد محترم اس بات کی بالکل تائید نہیں کرتے تھے۔وہ ہمیشہ میرے تلفظ درست کراتے اور میری حوصلہ افزائی کرتے رہتے۔اس طرح مجھے پڑھنے اور لکھنے کا شوق دن بدن بڑھتا گیا اور میں نے شعر کہنے شروع کردیے اس طرح میری ادبی زندگی کی ابتداء گھر سے ہی شروع ہوئی''

ابتدا میں ترنم ریاض نے شعروشاعری کو موضوع سخن بنایا۔بعد

ازاں وہ نثر کی طرف بھی راغب ہوئیں اور ان کی شہرت بھی نثری اصنافِ سخن سے ہوئی۔ اگر چہ انھوں نے نثر کے مختلف شعبوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''یہ تنگ زمین'' 1998 میں شائع ہوا، دوسرا افسانوی مجموعہ ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' 2000 میں اور تیسرا افسانوی مجموعہ ''یمبر زل'' 2004 میں شائع ہوا۔ ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ ''مرا رختِ سفر'' 2008 میں شائع ہوا ''مرا رختِ سفر'' کے افسانے اسی خیال کی توثیق کرتے ہیں۔ ان کے افسانے ''مجسمہ'' کو وارث علوی نے آرٹ کی معراج قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''افسانہ نگار نے ایک مجسمے میں پوری نسائیت اور انسانیت، پوری ایک قوم، ملک اور تاریخ کی ٹریجڈی کا زہر بھر دیا ہے، یہ آرٹ کی معراج ہے۔ اپنے بہترین افسانوں میں ترنم ریاض نے آرٹ کی بلندیوں کو چھو لیا ہے''

(گنجفہ بازخیال، وارث علوی، نئی دہلی 2007، ص۔160)

جموں وکشمیر کی خواتین افسانہ نگاروں میں نصرت چودھری کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ موصوفہ کا اصلی نام نصرت آرا چودھری تھا۔ ان کی پیدائش 18 مارچ 1953 میں ہوئی۔ ان کے آبا واجداد زمیندار تھے۔ نصرت چودھری کے والد کا نام چودھری عبدالرحیم تھا۔ ان کا ذہن شروع سے ہی افسانہ کی طرف مائل تھا۔ اگر چہ انھوں نے ادبی زندگی کا سفر شاعری سے کیا لیکن بہت جلد افسانے کی طرف بھی مائل ہوئیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے تنقید و تحقیق پر بھی اہم کام کیا۔

نصرت چودھری کا افسانہ ''آگ'' ہے جو رسالہ ''ہمارا ادب'' میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے پر نصرت چودھری کو انعام سے بھی نوازا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کا ایک افسانہ ''آنسوؤں کا کفن'' بھی بہت مشہور ہے جس کو ادبی دنیا میں کافی سراہا گیا۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''سفر چہرے کا'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ نصرت چودھری نے اپنے افسانوں میں صنفِ نازک کے جذبات اور احساسات کے ساتھ ساتھ غمِ حیات کے مسائل کو بھی اجاگر کیا ہے۔

اکیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں میں نعیمہ احمد مہجور کا نام اہم ہے، وہ 19 اگست 1955 میں ڈل گیٹ بچھوارہ سرینگر میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے ایم۔اے (اردو) تک تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد ڈپلوما ان جرنلزم بھی کیا۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانوں سے کیا اگر چہ آج وہ بہت کم افسانے لکھتی ہیں۔ ان کے افسانے مقامی اخبارات اور مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے افسانے 'آگ' 'سیاہ رات کی چاندنی' 'اس بستی کی رات' 'سفید چاندنی' وغیرہ اچھے افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اپنے افسانوں میں وہ زندگی کے مختلف مسائل کو نئی تکنیک اور نئے اسلوب کے ساتھ بڑی چابکدستی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں معاشرے میں ہونے والی ناانصافیاں، ظلم و جبر اور استحصال کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کی تحریروں میں کشمیر کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ ان دھڑکنوں میں محبت کی گرمی ہے، انسانی دکھ سکھ ہے۔

اکیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں میں زنفر کھوکھر کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ زنفر کھوکر 1957 کو مینڈھر پونچھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئیں۔ ابتدا سے ہی وہ نثر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ان کی پہلی کہانی کا عنوان ''نسخہ'' تھا۔ ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں زنفر کھوکھر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خوابوں کے اس پار'' ہے یہ 1999 میں شائع ہوا۔ اس افسانوی مجموعہ میں کل تیس افسانے شامل ہیں۔

زنفر کھوکھر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''کانچ کی سلاخ'' (2004) ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں کل چھبیس افسانے شامل ہیں جن میں نو مزاحیہ افسانوں کے علاوہ سترہ سنجیدہ افسانے بھی ہیں۔ اس افسانوی مجموعہ میں زنفر کھوکھر نے اپنے گرد و پیش میں ہونے والے واقعات و حادثات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

زنفر کھوکھر نے اپنے افسانوں میں خواتین پر ہو رہے ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ ''عبرت'' (2010) زنفر کھوکھر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس افسانوی مجموعہ میں کل پچیس افسانے ہیں جو ان کے فن اور صلاحیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ افسانوی مجموعہ ''عبرت'' کو پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ زنفر کھوکھر نے اپنے ذاتی تجربے اور واقعات کے نقشے کو قاری کے سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے۔

زنفر کھوکھر جو ہم عمر افسانہ نگاروں میں شمار ہوتی ہیں وہ ایک نئی فکر اور نئی سوچ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس لیے انھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی سماجی، معاشی، اقتصادی اور انسانی زندگی کے مختلف رشتوں کی عکاسی کی ہے۔ دراصل اس عبوری دور کی پہنائیوں میں جو واقعات و حادثات رونما ہوئے انھیں حقیقت کا پیکر عطا کرنے کے لیے فنی مہارت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی سادگی، الفاظ کی شگفتگی پر بھی مکمل دسترس حاصل ہے۔ جہاں تک ان کی زبان و بیان اور فن کا تعلق ہے اس پر وہ کھری اترتی ہیں۔ یہی ان کے فن کا کمال ہے جس کی وجہ سے آج بھی لوگ ان کی کہانیوں کو نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ دلچسپی سے پڑھتے بھی ہیں۔ ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ 2016 میں شائع ہوا۔

سیدہ نسرین نقاش کا شمار بھی جموں و کشمیر کی خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، وہ بیک وقت افسانہ نگار، ادیب اور شاعرہ ہیں۔ سیدہ نسرین نقاش 1964 کو سرینگر میں پیدا ہوئیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''ماں'' تھا۔ لیکن اشاعت کے تعلق سے ان کا پہلا افسانہ ''دھوکہ'' ہے جو ماہنامہ ''روشن ادب'' دلی میں 1987 میں شائع ہوا۔ ان کا ذہن شروع سے ہی شعر و شاعری کی طرف مائل تھا۔ ان کی پہلی غزل روزنامہ ''پرتاپ'' میں 1987 میں شائع ہوئی۔

ان کا افسانوی مجموعہ ''سلگتی لکیریں'' کے عنوان سے منظر عام پر آچکا ہے۔ موصوفہ نے اپنے افسانوں میں متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کو پیش کیا ہے۔ خانگی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اکثر ان کے افسانوں کا موضوع ہوتے ہیں۔ ان کو اپنی شعری تخلیق ''دشتِ تنہائی'' پر کئی اداروں نے انعام سے بھی نوازا ہے۔ وہ کئی عالمی کانفرنسوں میں بھی شرکت کر چکی ہیں اور اس تعلق سے انھیں سعودی عرب، انگلینڈ، دبئی اور قطر جانے کے مواقع حاصل ہو چکے ہیں۔ موصوفہ نے سہ ماہی بین الاقوامی صدا کی اشاعت 2000 میں شروع کی تھی اور یہ رسالہ آج بھی شائع ہو رہا ہے۔ پندرہ روزہ ''المجور'' بھی ان کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ نسرین نقاش ملکی سطح پر بھی کئی ادبی تنظیموں سے منسلک ہیں ان میں ''عالمی اردو فاؤنڈیشن''، ''عالمی اردو پنچ'' اور ''اردو کلچر سوسائٹی'' قابل ذکر ہیں۔ اردو زبان و ادب سے انھیں بہت لگاؤ ہے اس زبان کے فروغ کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں۔

نکہت سعید قریشی کا شمار بھی جموں و کشمیر کی خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا قلمی نام نکہت فاروق نظر ہے۔ موصوفہ 19 جولائی 1966 کو سرینگر میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا سفر شاعری سے شروع کیا لیکن جلد ہی نثر کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ان کے افسانوں میں بھی ان کی شاعری کی طرح رنگ آمیزی ملتی ہے اور یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ وہ ایک باصلاحیت افسانہ نگار ہیں یا شاعرہ۔ نکہت نے افسانہ نگاری کا آغاز 1988 سے کیا لیکن انھوں نے افسانہ نگاری میں اپنی پہچان 1990 کے بعد بنائی۔ ان کے افسانے قابل قدر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں، ان کے بعض افسانے ریڈیو سے بھی نشر ہوئے۔ سید نکہت فاروق نظر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''قہر نیلے آسمان کا'' 2009 میں شائع ہوا۔ اس میں ان کے پندرہ افسانے شامل ہیں۔ عرشی، آدھے ادھورے خواب، اور زمین جاگ اٹھی، ایک خواب ادھورا سا، موت کا فرشتہ، آگ دھواں، دائرے، گاشی، تار تار آنچل، ریزہ ریزہ وجود، کچھ خواہشیں مرتی نہیں، شفق رنگ شباب، درد بیتے لمحوں کا، سراب، ویرانیاں، ہیں۔ ہر افسانہ نئی صورت حال لے کر آیا ہے اور پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔ نکہت کے افسانوں میں معاشرے کی بدحالی کا عکس نظر آتا ہے۔

نئی صدی میں ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ریاست کی مشہور افسانہ نگار ہیں۔ نیلوفر ناز نحوی کا تعلق سرینگر سے ہے۔ ان کے اب تک تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''چنار کے برفیلے سائے'' 2013 میں منظر عام پر آیا۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''خاموش آسمان'' 2015 میں شائع ہوا اور ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''اور روزن پہ میرے چاند'' 2018 میں شائع ہوا۔ وہ ریاست کی باصلاحیت افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیاں ریاست کے مختلف اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ نیلوفر ناز نحوی بنیادی طور پر ایک کہانی کار ہیں وہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھتی ہیں انھیں دراصل اس بات کا احساس ہے کہ اکیسویں صدی کا انسان جو سائنسی اور تکنیکی ترقی والے دور میں مصروفیت کا شکار ہے، اسے ذہنی آسودگی اور تازگی فراہم کرنے کے لیے مختصر نویسی ایک موثر ذریعہ ہے اس امر حقیقی کا اعتراف پروفیسر حامدی کاشمیری نے ان الفاظ میں کیا ہے؛

''نیلوفر ناز کے افسانوں کا اسلوب لسانی اور حقیقت کو خواب میں بدلنے کا جو انداز ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کی افسانہ

نگاری کی یہ خوبی نمایاں ہے کہ وہ کرشن چندرانہ طول وطویل تمہید و بیان سے احتراز کرتی ہیں ۔ اختصار پسندی ان کے افسانوں کی پہچان ہے۔"

(چنار کے برفیلے سائے 2013،ص۔8)

نیلوفر ناز نحوی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں کشمیر کے پرآشوب دور کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے۔

جموں وکشمیر کی خواتین افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام تبسم ضیاء کا بھی ہے ۔ وہ عصر حاضر کی ایک باصلاحیت افسانہ نگار ہیں ۔ انھوں نے ادبی سفر کا آغاز نثر سے ہی شروع کیا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''رمق'' کے عنوان سے 2016 میں منظر عام پر آیا۔ مقامی روز ناموں میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ ان کے زیادہ تر افسانے عورتوں کے متعلق ہیں ۔عورت کے استحصال اور جہیز کے بڑھتے لین دین کے ساتھ ذہنی انتشار، الجھنوں اور طبقہ نسواں کی بکھرتی زندگی کے مسائل کا بھرپور احاطہ ان کے افسانوں کا موضوع ہیں ۔ انھوں نے عورتوں کے دکھ سکھ، خوشیوں اور بنتے بگڑتے رشتوں کو مشاہدے اور تخیل سے اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ان کے افسانوں کی کردار نگاری عمدہ ہے ان کے افسانوں میں مکالمہ نگاری کی بہترین تصویریں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

ریاست کی خواتین افسانہ نگاروں میں شبنم بنت رشید کا نام بھی شامل ہے۔ شبنم جنوبی کشمیر کے پہلگام علاقہ سے تعلق رکھتی ہیں اگر چہ ان کا کوئی بھی افسانوی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا، لیکن کچھ عرصے سے ان کی افسانوی کاوشیں اخبارات کی زینت بن رہی ہیں ۔ خاص کر اخبار ''کشمیر عظمیٰ'' کے ہفتہ واری ادب نامہ میں ان کی متعدد کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ شبنم کی کہانیوں میں جہاں عالمی سطح پر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات سے روایتی سماج کی عکاسی نظر آتی ہے، وہیں تصادم آرائیوں کے حامل خطوں میں ابھرنے والی نفسیات اور عام انسان پر پڑنے والے اس کے اثرات کا واضح نقشہ نظر آتا ہے جسے وہ خوبصورت زبان و بیان کی مدد سے حقیقی رنگوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

ممتاز کوثر عصر حاضر کی خواتین افسانہ نگاروں سے تعلق رکھتی ہیں ۔ اس لیے وہ ایک نئی فکر، ایک نئی سوچ کی ترجمانی کرتی ہیں ۔ ان کا تعلق وادی چناب سے ہے ۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''برف کی ایک رات'' ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں نئے نئے موضوعات کو جگہ دی۔انھوں نے اپنے گرد وپیش میں ہونے والے واقعات اور حوادث کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔انسانی زندگی کی عکاسی وہ بڑی بے باکی کے ساتھ کرتی ہیں ۔سیدھی سادی زندگی کی کہانی کو وہ بڑے موثر انداز کے ساتھ سادہ پلاٹ اور سادہ زبان میں پیش کرتی ہیں ۔انھوں نے اپنے افسانوں میں متوسط طبقے کی گھریلو زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔''برف کی ایک رات'' ان کا ایک مقبول افسانہ ہے جس میں عورت کی نفسیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔سیدھی سادھی زبان میں بہت بڑی بات کہنے کا ہنر ان کو خوب آتا ہے اور یہی بات افسانے کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔

ریاست کی خواتین افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام میت کور کا بھی ہے۔انھوں نے ابھی ابھی افسانہ کی دنیا میں قدم رکھا ہے۔میت کور کا تعلق صوبہ جموں سے ہے۔آپ کا پیشہ انجینئرنگ کا ہے ۔ان کا ابھی تک کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوا البتہ ان کے افسانے ریاست کے اخباروں کی زینت بنتے رہتے ہیں ۔ان کے افسانوں کے زیادہ تر موضوع سماج میں پیدا ہونے والے مسائل ہیں ۔سماج میں عورتوں پر ہونے والی زیادتیاں، نابرابری، حق تلفی، ظلم وستم ، وغیرہ جیسے موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ان کے دو افسانے بہت مقبول ہیں ایک ''دانے دانے پہ ہے'' اور دوسرا ''بوجھل قدم'' انھوں نے عورت کے درد کو محسوس کیا ہے اس کی عمدہ مثال ان کا افسانہ ''بوجھل قدم'' ہے۔

ریاست کے افسانوی افق پر اور بھی کئی خواتین افسانہ نگاروں کے نام ہیں جو کچھ عرصے سے کہانیاں لکھنے میں مصروف ہیں ۔ان میں رافیعہ رسول مغموم، رافیعہ ولی، بینا یوسف، زبیدہ گلزار، شمیمہ صدیقی اور عزرا بنت گلزار، وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے موجودہ دور میں جس طرح ریاست کی خواتین افسانہ نگار مرد افسانہ نگاروں کے ساتھ قدم ملا کر آگے بڑھ رہی ہیں اور اردو افسانے کو نئی جہتوں سے روشناس کرا رہی ہیں اس سے یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ریاست کشمیر کے منظر نامے میں خواتین افسانہ نگاروں کا مستقبل تابناک ہے۔

□□□

**Masrat Ara**
Ph.D Scholar, Dept. of Urdu
Kashmir University
Hazratbal
Srinagar-190006
masratara98@gmail.com

کہانیاں

شہانہ اقبال

# راحت جاں

میں اپنی بہو کے ساتھ ایک فنکشن ہال کی چکاچوند روشنیوں میں بیٹھی مہمانوں کا جائزہ لے رہی تھی، مجھ سے کچھ فاصلہ پر ایک پُرکشش اور مہذب خاتون بیٹھی تھی، جو مجھے بڑے تجسس سے دیکھ رہی تھی، پتہ نہیں وہ کون سا تعلق تھا جو میں بھی وقفہ وقفہ سے ان کی طرف دیکھ لیتی تھی، اس خاتون نے بڑے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے مجھے اشارے سے ہیلو کہا، میں نے بھی خوشدلی سے ان کے ہیلو کا جواب دیا، ہم دونوں ہی گہری نظروں سے ایک دوسرے کا جائزہ لے رہی تھیں، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں، اچانک وہ خاتون اُٹھیں اور میرے قریب آ کر کھڑی ہوگئیں اور بڑی اپنائیت سے پوچھا: کیا آپ زرینہ ٹیچر کی بیٹی ہیں......؟"

"جی ہاں......!" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا: "آپ کون ہیں؟ میں نے آپ کو نہیں پہچانا؟"

"میں افسر جہاں کی بیٹی ہوں! آپ کی امی اور میری امی دونوں ایک ہی اسکول میں ٹیچر تھیں۔"

میں مارے خوشی کے اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور انھیں کرسی پیش کرتے ہوئے بولی:

"آیئے! بیٹھئے! مجھے اچھی طرح یاد ہے، افسر آپا کے ساتھ ایک گول مٹول پیاری سی لڑکی ہمارے گھر آتی تھی۔" میں نے اُن سے ہاتھ ملاتے ہوئے خوشدلی سے کہا اور پورے جوش سے ان سے بغلگیر ہوگئی۔

"جی! آپ نے ٹھیک پہچانا، وہ گول مٹول لڑکی میں ہی ہوں...... نجمہ۔" وہ ہنس کر بولیں۔

"معاف کیجئے! اُن دنوں آپ بہت چھوٹی تھیں جب میں شادی کے بعد باہر چلی گئی تھی اس لیے آپ کو پہچان نہیں پائی۔" میں نے معذرت چاہی، "مجھے فریسہ حَسن کہتے ہیں۔"

ہم دونوں ہی ماضی کی یادوں میں کھو گئے، پرانے دنوں کے ذکر کے ساتھ میں اپنی امی کو یاد کر کے روہانسی ہوگئی، ان کی عظیم شخصیت اور ہماری پرورش کے لیے ان کی بے مثال قربانیاں یاد آئیں تو میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔

افسر جہاں کا تعلق ایک مرفع الحال خاندان سے تھا، جو شوقیہ درس و تدریس سے جڑی ہوئی تھیں، ان کے شوہر ایک گورنمنٹ انجینئر تھے، جو کبھی کبھی اپنی بڑی سی کار میں اپنی بیگم کو مدرسہ چھوڑنے آتے تھے، ورنہ ہر روز ان کا ڈرائیور ہی یہ خدمت انجام دیتا تھا۔

میری امی کثیر العیال ہونے کی وجہ سے ہمیشہ مالی پریشانیوں میں گھری رہتی تھیں، ایسے میں افسر آپا میری امی کی مدد کیا کرتی تھیں، کبھی کبھی مالی ضرورت اتنی شدید ہوتی کہ نوبت سودی قرض کی آجاتی، ایسے میں افسر آپا اُن کی مدد کر کے ان کا حوصلہ بڑھاتی تھیں، ان کے تعاون سے میری امی سودی قرض لینے سے بچ جاتیں، جس کا حصول میری امی کو بالکل پسند

نہیں تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب میری بڑی بہن کی شادی طے ہوئی تو ہمارے ہاں کوئی تیاری نہیں تھی اور نہ کوئی سرمایہ، دولہا والوں کا اصرار تھا کہ شادی ایک ماہ کے اندر اندر کی جائے، میری امی بہت پریشان ہوئیں، ایسے میں افسر آپا نے اسکول میں کمیٹی ڈلوائی اور پہلی کمیٹی میری امی کو دلوائی اور پھر اپنے پاس سے باقی مطلوبہ رقم کا بھی انتظام کیا، تب کہیں جا کر میری بہن کی شادی انجام پا سکی۔

افسر آپا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے قرض دیے گئے روپیوں کا کبھی مطالبہ نہیں کرتی تھیں، میری امی اپنی سہولت سے قرض اقساط میں ادا کرتیں تو بڑی نرمی سے کہتیں: ”اتنی جلدی بھی کیا تھی؟! آپ تو قرض کی ادائیگی کو اپنے حواس پر سوار کر لیتی ہیں۔“

”آپ وقت پر قرض دیتی ہیں، یہی احسان بہت ہے، اگر قرض ادا نہیں کروں گی تو وقت ضرورت نیا قرض کیسے ملے گا۔“ میری امی احسان مندی سے کہتیں۔

میں نے پوری عقیدت اور دیانت داری سے نجمہ کے آگے ماضی کے کئی صفحے کھول کر رکھ دیے، اس خیال سے کہ شاید وہ اس بارے میں جانتی نہ ہو، میری امی نے مجھے اپنے محسن کا احسان ماننے اور اس کا ذکرِ خیر کرنے کی تربیت دی تھی۔

میری باتیں سن کر نجمہ انکساری سے مسکرا دی اور بولی: ”مجھے بھی اچھی طرح یاد ہے، میری امی قدرے موٹی تھیں، اس لیے بھاری ساڑیوں کے ساتھ جو بلاؤز پیس آتے تھے، انھیں ٹیلر یہ کہہ کر واپس کر دیتا تھا کہ اس میں آپ کا بلاؤز نہیں بن سکتا، تب زرینہ آپا اپنی خدمات پیش کرتیں اور بڑی کفایت اور مہارت سے اُسی کپڑے میں بلاؤز سی کر دیتیں، میری امی اس بات کے لیے ہمیشہ ان کی احسان مند رہتی تھیں اور جب بھی ذکر نکلتا انھیں بے شمار دعائیں دیتی تھیں۔

نجمہ اور میں بہت دیر تک بیٹھی ماضی کی باتیں کرتی رہیں، اپنی اپنی والدہ کا ذکر ایک دوسرے سے سن کر اور سنا کر خوش ہوتی رہیں، ہم دونوں ایک ایسے رشتہ میں بندھ گئی تھیں جو صرف احساس کا ہوتا ہے، جہاں نہ کوئی محسن تھا اور نہ کوئی احسان مند۔

”میرے شوہر سعودیہ میں ملازم ہیں، بڑی بیٹی کی شادی کو چار سال گزر چکے ہیں، دوسرا بیٹا ایم ٹیک کر رہا ہے، دوسری بیٹی گریجویشن کے بعد بی ایڈ کر چکی ہے، چھوٹا بیٹا بی ٹیک کر رہا ہے۔“ نجمہ نے اپنے بارے میں مکمل تعارف دیتے ہوئے میرے تعلق سے جاننے کی خواہش کی۔

”اللہ کا کرم ہے! دوبئی سے واپس آنے کے بعد میرے میاں محسن نے یہاں کاروبار شروع کیا، جو الحمدللہ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے، بڑا بیٹا ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم ہے، اس کی شادی ہو چکی ہے، اس کی ایک پیاری سی بیٹی ہے، دوسری بیٹی کے دو بیٹے ہیں جو اپنے سسرال کے ساتھ بنگلور میں رہتی ہے، چھوٹا بیٹا ایم بی اے کر کے ایک نیشنل کمپنی میں کام کر رہا ہے۔“ میں نے اپنے بارے میں تفصیل بتائی۔

میں اور نجمہ اکثر فون پر بھی رابطہ کیا کرتی تھیں، اور ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کا سلسلہ بھی چل نکلا تھا، یہ ملاقاتیں ہماری دوستی کی بنیاد بنیں، ہماری اکثر عادتیں ایک جیسی ہوتی تھیں، شاید اس لیے کہ ہم نے قوم کے معماروں کے گھروں میں تربیت پائی تھی، جہاں یہ سکھایا جاتا ہے کہ تعاون دینے والا تعاون لینے والے کو محسن سمجھے کہ وہ اُسے نیکی کمانے کا موقع دے رہا ہے اور مدد خواہ مددگار کو محسن سمجھے کہ وہ اس کی ضرورت کے وقت اس کی مدد کر رہا ہے، ہم دونوں اچھے دوست بن چکے تھے۔

**”ایک سہ پہر میں نجمہ سے ملنے اس کے گھر گئی، اس کی بیٹی نے دروازہ کھولا اور مجھے نجمہ کے بیڈ روم میں لے گئی، جہاں وہ کچھ پریشان سی پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی، مجھے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی اور یہ کہتے ہوئے واش روم چلی گئی کہ آپ بیٹھیں میں بس دو منٹ میں آئی، وہ شاید فریش ہونے گئی تھی، اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔“**

ایک سہ پہر میں نجمہ سے ملنے اس کے گھر گئی، اس کی بیٹی نے دروازہ کھولا اور مجھے نجمہ کے بیڈ روم میں لے گئی، جہاں وہ کچھ پریشان سی پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی، مجھے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی اور یہ کہتے ہوئے واش روم چلی گئی کہ آپ بیٹھیں میں بس دو منٹ میں آئی، وہ شاید فریش ہونے گئی تھی، اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔

مجھے حیران دیکھ کر عالیہ نے کہا: ”اچھا کیا آنٹی جو آپ آ گئیں! ابھی کچھ دیر پہلے کچھ مہمان آئے تھے، ان کے جانے کے بعد امی بہت ڈسٹرب ہیں، آپ سے بات کر کے یقیناً بہل جائیں گی۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھتی نجمہ آگئی اور عالیہ یہ کہہ کر کمرے سے چلی گئی کہ میں آپ دونوں کے لیے کافی لے کر آتی ہوں۔

عالیہ کے جانے کے بعد میں نے نجمہ کو چھیڑتے ہوئے پوچھا: ''کیا بات ہے؟ کیوں اُداس ہو؟ کیا نعیم بھائی کو مِس کر رہی ہو؟''

میری بات سن کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ بڑے درد سے بولی:

''نہیں! یہ بات نہیں، ابھی کچھ دیر پہلے عالیہ کو دیکھنے کچھ خواتین آئیں تھیں، میرے منہ پر انکار کر کے چلی گئیں، بس اِسی بات سے میں ڈسٹرب ہوں۔''

''میں نہیں مانتی!'' میں حیران رہ گئی، ''اتنی پیاری بچی کو کوئی کیسے ناپسند کر سکتا ہے؟''

وہ ایسے کہ اللہ نے میری پیاری بیٹی کے نصیب پیارے نہیں بنائے۔'' نجمہ نے بڑے درد سے کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''اپنے خالق کے لیے ایسے کلمات کہنا درست نہیں، جو اپنے بندوں سے ان کی ماؤں سے ستر گنا زیادہ محبت رکھتا ہے۔'' میں نے نجمہ کے آنسو پونچھتے ہوئے اُسے حوصلہ دلایا، ''ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ میں بھی خیر کا کوئی پہلو ہو، بندے کو بس شکر اور صبر سے اس کے فیصلہ کا انتظار کرنا چاہیے۔''

میری ہمدردی محسوس کر کے نجمہ سسکیاں بھر کر رونے لگی، میں خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی، اُسے جی بھر کر رو لینے کا موقع دیا تاکہ اس کا دل ہلکا ہوجائے، کچھ دیر رو لینے کے بعد جب وہ پُرسکون ہوئی تو اس نے خود ہی عالیہ کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

''بچپن میں ہوئے ایک حادثہ میں اس کی جان تو بچ گئی' لیکن دماغ کی ایک رگ بری طرح دب گئی، جس کی وجہ سے اس کا بایاں ہاتھ متاثر ہوگیا، دائیں ہاتھ سے قدرے چھوٹا ہے، انگلیوں کی گرفت بھی مضبوط نہیں ہے۔''

''اچھا!'' میں نے حیرت سے کہا، ''میں نے تو کبھی محسوس نہیں کیا، حالانکہ عالیہ سے کئی بار مل چکی ہوں۔''

''زیادہ نہیں! بس انیس' بیس کا فرق ہے، بہت غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے، ویسے عالیہ بڑی حساس اور سمجھ دار لڑکی ہے، وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ کوئی اس بات کو محسوس نہ کرے۔'' نجمہ نے کہا۔

''تو پرابلم کیا ہے؟'' میں نے پوچھا، ''جب سامنے والا محسوس نہیں کرتا تو اُسے احساس دلانے کی ضرورت کیا ہے؟''

''لڑکے والوں کو حقیقت بتائے بنا رشتہ طے کرنا انہیں دھوکہ دینے کے برابر ہے جو شادی کے بعد نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے، خواتین عالیہ کو دیکھ کر پسند کرلیتی ہیں' لیکن جیسے ہی میں انہیں اصلیت بتاتی ہوں تو یہ کہہ کر انکار کردیتے ہیں کہ ''اپاہج سے کون شادی کرے گا؟'' نجمہ آنسوؤں سے بھرّائی آواز پر قابو پانے کے لیے کچھ دیر کو خاموش ہوگئی، اپنی سانسوں پر قابو پانے کے بعد میرے دونوں ہاتھ تھام کر بے قراری سے رونے لگی، گردن نفی میں ہلاتے ہوئے روہانسی آواز میں بولی۔

''لڑکے والوں کو حقیقت بتائے بنا رشتہ طے کرنا انھیں دھوکہ دینے کے برابر ہے جو شادی کے بعد نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے، خواتین عالیہ کو دیکھ کر پسند کرلیتی ہیں' لیکن جیسے ہی میں انھیں اصلیت بتاتی ہوں تو یہ کہہ کر انکار کردیتے ہیں کہ ''اپاہج سے کون شادی کرے گا؟'' نجمہ آنسوؤں سے بھرّائی آواز پر قابو پانے کے لیے کچھ دیر کو خاموش ہوگئی، اپنی سانسوں پر قابو پانے کے بعد میرے دونوں ہاتھ تھام کر بے قراری سے رونے لگی، گردن نفی میں ہلاتے ہوئے روہانسی آواز میں بولی۔

''میری عالیہ اپاہج نہیں ہے! وہ سارے کام عام لڑکیوں کی طرح کرلیتی ہے، اب تک آٹھ دس رشتے طے ہوتے ہوتے رہ گئے، پتہ نہیں میری بیٹی کب تک انتخاب کے پل صراط سے گذرتے ہوئے ناپسندیدگی کی کھائی میں گرتی رہے گی؟'' اتنا کہہ کر نجمہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اس کی تڑپ اور بے قراری دیکھ کر میری آنکھیں بھی اشکبار ہوگئیں، میں بہت دیر تک بیٹھی اُسے تسلی دیتی رہی۔

''تم پریشان نہ ہو، عالیہ کو اتنا اچھا رشتہ ملے گا جو تمھاری امیدوں سے بھی کہیں زیادہ بہتر اور لائق ہوگا۔''

''پتہ نہیں وہ مبارک دن کب آئے گا؟'' نجمہ مایوسی سے بولی، ''اس عمر میں تو میری فریحہ دو بچوں کی ماں بھی بن چکی تھی، عالیہ کو گریجویشن کیے ہوئے بھی تین سال گذر چکے ہیں۔''

عالیہ کافی لے کرآئی تو ہماری باتوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا، میں نے پہلی بار اُسے غور سے دیکھا، اونچا قد، کھلتا گورا رنگ، بڑی بڑی کالی آنکھیں، متناسب بدن، پہلی نظر میں پسند آنے والی پوری جاذبیت اس میں موجود تھی۔

عالیہ کھڑی بڑی مایوسی سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی، اُسے دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ بھی بہت دیر تک روتی رہی ہے، اس کا چہرہ دوپہر کی تیز دھوپ میں مرجھائے پھول کی طرح پژمردہ لگ رہا تھا، اُداسی نے اس کے سارے وجود کو نڈھال کر دیا تھا، اپنی ماں کو دیکھ کر وہ کچھ اور سوگوار ہوگئی، ہمیں کافی دینے کے بعد وہ فوراً باہر چلی گئی، شاید اس سے اپنی ماں کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

فون کی گھنٹی بجی تو نجمہ اُٹھ کر باہر چلی گئی، فون ریسیو کرنے کے بعد اس نے بتایا: ''نعیم کا فون تھا، لڑکے والوں کے انکار کا سن کر وہ بھی بہت مایوس ہوگئے، اللہ ہمارے حال پر رحم کرے اور بہت جلد ہماری بیٹی کا گھر بسادے۔'' نجمہ کی دعا سن کر میں نے پورے خلوص سے آمین کہا۔

مناسب رشتوں کے مسلسل انکار کے بعد میں نے اور نعیم نے سوچ لیا تھا کہ اگر لڑکے میں کوئی جسمانی نقص بھی ہوتو اُسے قبول کرلیں گے، ہمارے ایک شناسا نے ایک رشتہ ایسا بتایا جسے بچپن میں پولیو ہوگیا تھا، ایک پیر متاثر تھا، ایک گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر دوسرا پیر گھسیٹ کر چلتا تھا، لڑکا انٹر پاس تھا، اپاہج کے کوٹے میں گورنمنٹ جاب ملا تھا، گھر کا بڑا بیٹا تھا، اس کی دو چھوٹی بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی زیرِ تعلیم تھا، باپ اور بیٹے کی تنخواہ سے گھر چل رہا تھا، ذاتی گھر بھی نہیں تھا۔

''مناسب رشتوں کے مسلسل انکار کے بعد میں نے اور نعیم نے سوچ لیا تھا کہ اگر لڑکے میں کوئی جسمانی نقص بھی ہو تو اُسے قبول کرلیں گے، ہمارے ایک شناسا نے ایک رشتہ ایسا بتایا جسے بچپن میں پولیو ہوگیا تھا، ایک پیر متاثر تھا، ایک گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر دوسرا پیر گھسیٹ کر چلتا تھا، لڑکا انٹر پاس تھا، اپاہج کے کوٹے میں گورنمنٹ جاب ملا تھا، گھر کا بڑا بیٹا تھا، اس کی دو چھوٹی بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی زیر تعلیم تھا، باپ اور بیٹے کی تنخواہ سے گھر چل رہا تھا، ذاتی گھر بھی نہیں تھا۔''

لڑکے کے والد بڑے سمجھ دار ہیں، انھوں نے کہا: ''ہم نے آپ کی لڑکی کو اس لیے پسند کیا کہ دونوں کا موقف ایک جیسا ہے، دُکھ بھی مشترک ہیں، ایک دوسرے کے درد کو سمجھ کر رہیں گے تو زندگی ہنسی خوشی گزار لیں گے، صحتمند لڑکیوں کے والدین بھی ہمارے لڑکے کو بیٹی دینے کے لیے راضی تھے، لیکن ہم نے یہ سوچ کر قبول نہیں کیا، صحتمند لڑکی ہمیشہ ہمارے بیٹے کو کمتری کا احساس دلاتی رہے گی۔''

لڑکے کے والد کی یہ بات سن کر میں اور نعیم بہت خوش ہوئے، رشتہ پکا کردیا، شادی کی تاریخ اور تمام معاملات طے ہوگئے، میری بیٹی مدیحہ اور نعیم نے ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی بک کروالیے، فنکشن ہال بھی بُک ہوگیا، سارے انتظامات مکمل ہوگئے، اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو شادی ہونے والی تھی کہ آج اچانک دولہے کی والدہ اپنی نند کو لے کر آگئیں، عالیہ کو دیکھنے کی فرمائش کی، دیکھنے کے بعد انھوں نے کہا: ''ابھی آپ دعوت نامے تقسیم مت کیجیے، ہم سوچ کر نئی تاریخ دیں گے،'' یہ کھلا ہوا انکار ہے کہ نہیں؟'' نجمہ نے بڑے دُکھ سے سوال کیا۔

نجمہ کے ہاں کچھ مہمان آئے تو میں اس سے اجازت لے کر وہاں سے چلی آئی، راستے بھر میں بے چین رہی، کیا انسانوں میں انسانیت بالکل ختم ہوگئی ہے جو ایسے اہم معاملہ میں بھی وعدہ خلافی کرنے سے باز نہیں آتے، دوسروں کے احساسات مجروح کرکے یہ لوگ کیسے چین کا سانس لیتے ہوں گے؟ میری آنکھوں کے آگے سے ایک دُکھیاری ماں اور ایک بدنصیب بیٹی کا چہرہ ہٹتا نہ تھا، عالیہ کو اگر وقت پر مطلوبہ خوشیاں ملی ہوتیں تو وہ بھی بہاروں میں پھولوں سے لچکتی ڈالی کی طرح خوبصورت اور شادماں نظر آتی، خوبصورتی دراصل مسرور و مطمئن دلی جذبات کا نام ہے، جو لڑکیوں کی اداؤں میں دلربائی، چہرہ پر شگفتگی، آنکھوں میں چمک اور آواز میں کھنک پیدا کرتی ہیں۔

میں نے گھر پہنچ کر ڈور بیل بجائی، میڈ نے دروازہ کھولا، میں اندر داخل ہوئی تو سامنے دیوار پر میری نظر پڑی جس پر سنہری فریم میں جڑا طغریٰ آویزاں تھا، جس پر جلی الفاظ میں ایک عربی آیت لکھی تھی:

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔

طغرے پر لکھی آیت کا ایک ایک حرف میرے سامنے زندگی کے حقائق بیان کر رہا تھا، قرآنی تعلیمات اور حدیث پاک کا درس دے رہا تھا...... ''نیکی کا بدلہ نیکی ہے۔''

میں طغرے کے سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گئی اور طغرے کی

عبارت پر نظریں جمائے سوچنے لگی کہ میں ایسا کیا کروں کہ نجمہ کا غم بانٹ سکوں؟ کیا اور کیسے؟ کے چکر نے مجھے جکڑ رکھا تھا، میں ہال میں ٹہلتے ٹہلتے اللہ سے دعا مانگنے لگی کہ ''تو ہی مجھے راہ دکھا کہ ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کس طرح اُن کی مدد کرنی چاہیے؟''

ٹہلتے ٹہلتے تھک گئی تو اپنے کمرے میں آئی اور پلنگ پر لیٹ کر بھی عالیہ اور نجمہ کے بارے میں سوچتی رہی، اچانک ایک خیال بجلی کی طرح ذہن میں آیا، اگر عالیہ میری بیٹی ہوتی تو......؟ اس خیال کے آتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میرا کلیجہ منہ کو آ گیا ہو، بیچاری نجمہ یہ دُکھ کیسے جھیل رہی ہوگی؟ عالیہ کے حادثے کے بعد اس نے شاید ایک لمحہ بھی سکون سے نہیں گزارا ہوگا، اولاد کا دکھ بڑا جان لیوا ہوتا ہے، مَرے کا صبر آ جاتا ہے، لیکن چوبیسوں گھنٹے متاثر بچوں کو سامنے دیکھ کر ماں پل پل جیتی اور لمحہ لمحہ مرتی ہے۔

لیٹے لیٹے میری آنکھ لگ گئی، افسر جہاں آپا کی پُرخلوص اور باوقار شخصیت میرے سامنے آئی' جو پتہ نہیں کس موضوع پر میری امّی سے بات کر رہی تھیں، وہ خواب تھا کہ خیال' بہت دیر تک وہ دونوں میرے ذہن سے محو نہ ہو سکیں۔

بچپن میں نانی ماں سے سنی اَن گنت کہانیاں مجھے یاد تھیں جن میں دشمنیاں پیڑھی در پیڑھی چلتی رہتی تھیں، دونوں فریق ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے تھے' جس کی وجہ سے قتل و غارت گری عام ہو جاتی تھی، اور خاندان کے خاندان تباہ و برباد ہو جاتے تھے۔

میں نے سوچا نسل در نسل چلنے والی دشمنی کی طرح انسان کو اپنے بے لوث محسن کو بھی ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے، ان کے متعلقین کے ساتھ حسن سلوک کر کے مرحومین کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہیے، تاکہ دیکھنے اور سننے والے کو بھی نیکی کی توفیق ہوتی رہے، ان کے بعد بھی اُن سے منسوب سنہری یادیں برسوں تک دوہرائی جاتی رہیں۔

میری امی' ہمیں نصیحت کرتی تھیں کہ غیرت مند انسان احسان کرنے والے کے ساتھ زندگی بھر حسن سلوک کر کے بھی اپنے محسن کا احسان نہیں ادا کر سکتا، جبکہ ایک عام انسان اپنے محسن کا شکریہ ادا کر کے سمجھتا ہے کہ اُس نے اپنے محسن کا حق ادا کر دیا، اور بے غیرت انسان نہ اپنے محسن کا شکریہ ادا کرتا ہے اور نہ ہی اُسے دعا دیتا ہے۔

اپنی امی کی یہ نصیحت یاد آتے ہی میں نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ عالیہ کو اپنی بہو بنا کر نجمہ کو اس کربِ مسلسل سے نجات دلاؤں گی، ''احسان'' کا بدلہ 'احسان'' آیت کا مطلب بھی میرے ارادے کو تقویت دیتا رہا۔

شام کے سات بجنے والے تھے، شکیل کے گھر آنے کا وقت ہو چکا تھا، اُس کی آمد کے ساتھ ہی میں اس سے اس موضوع پر بات کرنا چاہتی تھی کیونکہ جانتی تھی کہ گزرتے لمحوں کے ساتھ کسی بھی جذبہ کی شدت میں کمی آنے لگتی ہے۔

شکیل کے آتے ہی میں نے دن بھر کی رُوداد سنا کر اپنی خواہش کا اظہار کیا، جسے سن کر اس نے کچھ ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے میں پاگل ہو گئی ہوں، ایک ماں اپنی اولاد کی آنکھوں کی زبان اچھی طرح سمجھ لیتی ہے، میں نے دو گھنٹے کی بات چیت کے بعد اُسے راضی کر لیا، اپنے بیٹے پر بھروسہ اور اعتماد نہ ہوتا تو اس کی زندگی کا اتنا بڑا اور اہم فیصلہ کیسے کر پاتی، بہر حال میں شکیل کی فرمانبرداری پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے، اس نے میری خواہش کا احترام کر کے اپنی ماں کے قدموں تلے اللہ تعالیٰ کی بنائی جنت کا خود کو حقدار بنا لیا۔

رات دیر گئے میٹنگ سے فارغ ہو کر حسن گھر آئے، میں اور شکیل ہال میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، ہمیں دیکھا تو وہ بھی ہمارے پاس آ پہنچے اور پوچھا:

''کیا بات ہے جو آج ماں اور بیٹے اتنی دیر تک باہر ہال میں بیٹھے ہیں؟''

''بات بہت خاص ہے! آیئے بیٹھئے، ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔'' میں نے انھیں عالیہ کے بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا، ''میں اور شکیل سوچ رہے ہیں کہ اُسے اپنے گھر کی بہو بنا لیں۔''

میری بات سن کر حسن' شکیل سے بھی زیادہ حیران ہو گئے، تعجب سے شکیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

''کیوں برخوردار؟ کیا تمھاری ماں سچ کہہ رہی ہیں؟''

''جی ابّو! اگر امی کی یہی مرضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

شکیل نے میری طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو! جلد بازی میں کیے گئے فیصلے بعد میں جی کا جنجال بن جاتے ہیں۔'' حسن بڑی نرمی سے بولے، ان کی حیرت برقرار تھی۔

''جی ابو! میں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے، ہماری مذہبی تعلیمات بھی والدین کا حکم ماننے کی تلقین کرتی ہیں۔'' شکیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ کیسے برخوردار؟'' حسن نے سوال کیا۔

''حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فرمانبرداری میں اپنی جان کی قربانی دینے کے لیے بخوشی راضی ہو گئے تھے، میں اتنی چھوٹی بات کے لیے اپنی ماں کو انکار کیسے کرتا؟''

شکیل کا جواب سن کر حسن قائل ہوگئے، تھوڑی سی ردّ وقدح کے بعد انھوں نے بات ہم دونوں کی مرضی پر چھوڑ دی، بیٹے کو گلے لگا کر مبارکباد دی۔

اس مرحلے سے فارغ ہوکر میں خوشی سے دیوانی ہوگئی، گھڑی دیکھی، رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے، میں نے سوچا میں اگر نجمہ کو خوش خبری سنانے کے لیے صبح کا انتظار کروں گی تو دونوں ماں بیٹی دُکھ اور ملال میں ساری رات کاٹیں گی، میں جلد سے جلد یہ نوید سنا کر انھیں خوشی اور اطمینان دینا چاہتی تھی۔

میں نے نجمہ سے فون پر رابطہ کیا،فون ریسیو کر کے نجمہ نے بڑی حیرت سے پوچھا:

''خیریت؟ رات کے اس وقت آپ نے کیوں فون کیا؟''

''تمھیں ایک خوش خبری دینی تھی؛ جس کے لیے میں صبح تک انتظار نہیں کرسکتی تھی۔''

نجمہ نے میری بات کا جواب نہیں دیا، دو منٹ گزر گئے تو میں نے پوچھا''کیا ہوا نجمہ؟ چپ کیوں ہوگئیں؟''

''کچھ نہیں! سوچ رہی تھی کہ کیا کسی خوش خبری کا تعلق میری ذات سے بھی ہوسکتا ہے؟'' اس کے لہجے سے مایوسی نمایاں تھی، شاید اس کے ہونٹوں پر سوگوار مسکراہٹ پھیل گئی ہوگی۔

''مایوسی کے خول سے نکل آؤ! اور سنو! عالیہ کی شادی پندرہ مئی ہی کو ہوگی، تمھیں کوئی آرڈر کینسل کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''وہ کیسے.....؟ کیا آپ نے لڑکے کے والدین کو راضی کرلیا ہے؟'' ناامیدی کے بھنور میں ڈوبی نجمہ نے اپنے گم ہوتے ہوئے حواس کے ساتھ پوچھا، وہ غریب شاید اس سے آگے کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔

''گولی مارو اُس لڑکے کے منافق والدین کو! میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ اللہ تعالیٰ ہماری عالیہ کے لیے اُس لڑکے سے بہتر اور قابلِ فخر شریکِ حیات عطا کرنے والے ہوں گے۔'' میں نے خوشدلی سے کہا۔

''میں اب بھی نہیں سمجھی! خدا کے لیے میرا صبر نہ آزمائیں، جلدی کہیے کیا بات ہے؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''میری پیاری سدھن! میں پندرہ مئی کو اپنے بیٹے شکیل کی بارات لے کر فنکشن ہال پہنچ جاؤں گی، تم اپنی بیٹی کی وداعی کی تیاریاں مکمل کرلو۔'' میں نے پورے خلوص اور عقیدت سے نجمہ کو یہ مژدۂ جاں فزا سنایا۔

''کیا واقعی یہ سچ ہے؟ جانے کیوں مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں آرہا ہے۔'' نجمہ نے دلگیر آواز میں پوچھا۔

''یقین نہ آنے والی کون سی بات ہے، کیا معجزات اللہ تعالیٰ کی طرف سے رونما نہیں ہوتے؟ میں نے تمھاری جگہ اپنے آپ کو اور عالیہ کی جگہ اپنی بیٹی کو رکھ کر سوچا تو تمھارے دُکھ کی شدت کا احساس ہوا، ایسے میں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یاد آ گیا کہ ''جو تو اپنے لیے چاہتا ہے، اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کر۔'' بس میں نے فرمانِ نبویؐ پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔'' میں نے نجمہ کو جواب دیا۔

میری بات سن کر وہ یوں خاموش ہوگئی جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، طویل خاموشی کے بعد میں نے پوچھا:

''کیا ہوا نجمہ؟ کیا سوچ رہی ہو؟''

''باجی! کیا آپ نے اپنے میاں اور بیٹے سے ان کی مرضی پوچھی ہے؟'' نجمہ کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

''تم گھبراؤ نہیں! ان دونوں کو راضی کرنے کے بعد ہی تمھیں فون کررہی ہوں۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''یہ معرکہ آپ نے کیسے سر کیا؟'' نجمہ کی آواز میں حیرت اور استعجاب تھا۔

''انسان کے جذبے صادق ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کی زبان میں تاثیر دے دیتے ہیں، میری دلیلوں کو قبول کرنے کے بعد ہی دونوں نے میری خواہش کا احترام کیا، جس کے لیے پہلے میں اپنے خالق کا شکریہ ادا کرتی ہوں، اس کے بعد اپنے میاں اور بیٹے کا۔'' میں نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

''اگر آپ میرے سامنے ہوتیں تو میں آپ کے گلے سے لپٹ کر اتنا روتی کہ میری ساری فکریں اور پریشانیاں آنسوؤں کے ساتھ بہہ جاتیں۔'' نجمہ نے اشکوں سے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

''جب ملوگی تو یہ بھی کرلینا، اب تو بس اتنا کہوں گی کہ سب کچھ بھول جاؤ اور بس اتنا یاد رکھو کہ عالیہ کل تک تمھاری بیٹی تھی؛ لیکن اب میرے لیے راحتِ جان بن گئی ہے، اور تم سے میرا وعدہ ہے کہ میں اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گی۔''

□□□

**Shahana Iqbal**
8-1-21/9, Surya Nagar
Tolichowki
Hyderabad-500008 (Telangana State)

ڈاکٹر فرخندہ ضمیر

# پھوٹڑی

"پھوٹڑی اٹھینے آ"، بھنوری نے بیٹی کو آواز دی۔ پھوٹڑی باہر نیم کے نیچے اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ماں کے آواز دینے پر بڑی مشکل سے آئی۔" کائیں ہو گیو ماں۔" "دیکھ مھاری پتر تھانے سورت جانو پڑیگو مجوری کے لیے۔" بھنوری نے بیٹی کو پاس بٹھا کر پیار سے کہا۔ "تو بھی چالے گی مھارے ساتھ" "نہ چھوری نہ تھارا باپو روگی تھارا بھائی روگی۔ دوروگی منکھ کو اٹھینے چھوڑ رکی کر جاسکوں۔" ماں کی بات سن کر پھوٹڑی روہانسی ہوگئی۔ ماں کے گلے میں بازو حمائل کرتے ہوئے بولی "تھانے چھوڑ کر نہ جاسکوں" "دیکھ مھاری لاڈو اب تیری مجوری سے ہی گھر چالے گا" پھوٹڑی کی آنکھوں کے آبگینے تر ہوگئے۔ ماں بھی آبدیدہ ہوگئی۔ غریب کیا کرے شکم کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے کلیجہ پر پتھر رکھنا پڑتا ہے۔ ابھی پھوٹڑی 14 سال کی تو تھی کمسن نوخیز کلی۔ پچھلی آکھا تیج پر تو اس کا بیاہ ہوا تھا۔ پاس کے گاؤں کے رمیشیا کے ساتھ۔ ایک سال بعد گونا ہونا تھا اس کے لیے بھی پیسے چاہیے تھے۔ مجبور و بےبسی ماں کو یہ قدم بہت مجبوری میں اٹھانا پڑ رہا تھا۔

پھوٹڑی اور اس کے والدین جودھپور کے پاس اوسیان گاؤں میں سکون کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہاں ریت کے سنہری ٹیلوں کی وجہ سے سیاحوں کو سفاری کرنے میں بڑا مزہ آتا۔ جب پھوٹڑی کا باپ اپنے سجے سنورے اونٹ پر بٹھا کر ریت کے ٹیلوں پر سیر کراتا تو سیاحوں کو اس کیمل سفاری پر بہت لطف آتا اور پھوٹڑی کا بھائی اپنی تیز رفتار جیپ میں سرعت سے ٹیلوں پر چڑھتا تو سیاح رومانچ سے چیخیں مارتے خوش ہوتے، اور دونوں باپ بیٹوں کی اچھی کمائی ہو جاتی۔ دال روٹی سکون سے میسر تھی، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پھوٹڑی کا باپ اتنی شراب پی گیا کہ شراب اس کو پی گئی اور وہ بستر پر پڑ گیا۔ بھائی جو چھوٹی سی عمر سے ہی جیپ چلانے لگا تھا بہت مہارت رکھتا تھا اونچے نیچے ٹیلوں پر گاڑی چڑھانے کی۔ ایک دن اونچے ٹیلے پر چڑھتے ہوئے گاڑی کے بریک فیل ہوگئے اور گاڑی 30 فٹ سے نیچے آکر گری، کئی سیاح زخمی ہوگئے اور اودے کے پیر میں فریکچر ہو گیا۔ اب وہ اس قابل نہیں تھا کہ گاڑی کے اسٹنٹ دکھا سکے۔ کبھی کبھی "نریگا" میں مزدوری مل جاتی تو گھر میں چولہا جلتا۔ فقط پھوٹڑی کی ذات تھی جو اس گھر کے چولہے کو روشن کر سکے۔ پھوٹڑی اکلوتی بیٹی تھی ماں نے اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اس کا نام پھوٹڑی رکھا تھا۔ یعنی "خوبصورت" ماں کا دل بڑا ہی بیقرار تھا لیکن مجبور و بےبس تھی۔ گاؤں کے کئی لوگ سورت کی کپڑا ملوں میں مزدوری کرنے جاتے تھے۔ بھنوری کے بھائی بھاوج بھی جا رہے تھے۔ اس لیے بھنوری بیٹی کو بھیجنے پر راضی ہو گئی۔ بھنوری کا چھوٹا بیٹا جھنور جو 5 سال کا تھا باہر سے آ کر پھوٹڑی سے

لپٹ گیا، بہن کے جانے کی خبر سن کر وہ بھی رونے لگا۔ ماں نے دونوں کو بڑی مشکل سے سمجھایا۔دوسرے دن ہی پھوٹری کا ٹین کا صندوق تیار ہوگیا۔سب نے ٹوٹے دل سے وداع کیا۔پھوٹری تو بہت دیر تک روتی رہی۔ پھوٹری پہلی مرتبہ گاؤں سے باہر نکلی تھی، کتنا ارمان تھا اسے گھومنے کا لیکن غریب کی خواہش کب پوری ہوتی ہے اور پوری بھی ہوئی تو اس طرح۔سروہی کے خوبصورت نظاروں نے ذرا دل بحال کیا، اس کے آنسو خشک ہونے لگے۔سروہی کے بس اسٹینڈ پر ان لوگوں نے باجرے کی روٹی اور چھاچھ سے شکم کی آگ ٹھنڈی کی۔اور آگے منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔پھوٹری سورت کی ملوں کی بڑی بڑی مشینوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔پہلے تو بہت خوف آیا لیکن آہستہ آہستہ چاروں ناچار اس ماحول سے مانوس ہوگئی۔لیکن جب رات کو تھک کر بستر پر لیٹتی تو اسے اپنے والدین عزیز رشتہ دار، گاؤں، سب یاد آتے۔رمیشیا کی یاد آتے ہی اس کے عارض سرخ ہوجاتے۔گھر والوں سے موبائل پر بات ہوتی تو وہ بات کم کرتی روتی زیادہ۔ادھر ماں کا بھی یہی حال ہوتا۔دونوں مجبور و بے بس۔زندگی کے شب و روزیوں ہی گزرتے رہے۔مہینے کے آخر میں جب پہلی تنخواہ ہاتھ میں آئی تو کلفتیں کچھ کم ہوئیں۔ماما نے 100 روپیہ اس کو ہاتھ خرچ کے دے کر بہن بھنوری کو ساری رقم بھیج دی۔پھوٹری شہر کی عورتوں کو رنگ برنگے ملبوسات وزیورات میں دیکھتی تو اس کا دل مچل مچل اٹھتا۔جب دوسری تنخواہ آئی تو اس نے ماں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن وہی محرومیاں مجبوریاں سامنے آگئیں۔وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ابھی وہ کمسن کلی تھی، قوس وقزح کے رنگ اس کی آنکھوں میں رقص کرتے، تتلی کی طرح اڑنے کا دل کرتا۔تین مہینے میں اس نے ماما کے دیے ہوئے 300 روپیہ جمع کر لیے۔کھانے پینے کا خرچ ماما اٹھاتے۔اس نے مامی سے ضد کر کے سرخ رنگ کا بڑے بڑے ستاروں والا گھاگھرا اوڑھنی بڑے ہی ارمانوں سے لیا کہ وہ اپنے گونے پر پہنے گی، زیورات کی چمک بھی آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی لیکن، بقول غالب ”ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے“ روز رات کو تھک کر بستر پر لیٹتی تو حسین خوابوں کی وادیوں میں سیر کرتی۔جب وہ یہ گھاگھرا اوڑھنی پہن کر کانوں میں جھمکے،

**”دوسرے دن ہی پھوٹری کا ٹین کا صندوق تیار ہو گیا۔ سب نے ٹوٹے دل سے وداع کیا ۔پھوٹری تو بہت دیر تک روتی رہی۔ پھوٹری پہلی مرتبہ گاؤں سے باہر نکلی تھی، کتنا ارمان تھا اسے گھومنے کا لیکن غریب کی خواہش کب پوری ہوتی ہے ،اور پوری بھی ہوئی تو اس طرح۔سروہی کے خوبصورت نظاروں نے ذرا دل بحال کیا، اس کے آنسو خشک ہونے لگے ۔سروہی کے بس اسٹینڈ پر ان لوگوں نے باجرے کی روٹی اور چھاچھ سے شکم کی آگ ٹھنڈی کی ۔اور آگے منزل کی طرف روانہ ہو گئے ۔پھوٹری سورت کی ملوں کی بڑی بڑی مشینوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی ۔پہلے تو بہت خوف آیا لیکن آہستہ آہستہ چاروں ناچار اس ماحول سے مانوس ہو گئی ۔لیکن جب رات کو تھک کر بستر پر لیٹتی تو اسے اپنے والدین عزیز رشتہ دار، گاؤں، سب یاد آتے ۔رمیشیا کی یاد آتے ہی اس کے عارض سرخ ہو جاتے ۔گھر والوں سے موبائل پر بات ہوتی تو وہ بات کم کرتی روتی زیادہ۔ادھر ماں کا بھی یہی حال ہوتا۔دونوں مجبور و بے بس۔زندگی کے شب و روزیوں ہی گزرتے رہے۔“**

ماتھے پر بورلا، ناک میں نتھنی، بازوؤں میں بازو بند، ہاتھوں میں کڑے اور کمر میں کنکتی، پاؤں میں پازیب پہن کر چھم چھم کرتی اٹھلاتی بل کھاتی اپنے بیندر میشیا کے سامنے جائے گی تو رمیشیا کتنا خوش ہوگا۔اس نے رمیشیا کو پہلی مرتبہ پھیروں پر دیکھا تھا، دو دن برات رکی تھی۔اس نے آم کے پیڑ سے ڈھیر ساری کھٹی میٹھی کیریاں توڑ کر دی تھیں۔پھوٹری کو اس نے جن شوخ نظروں سے دیکھا تھا وہ نظریں پھوٹری کے دل و دماغ کو روشن کر گئی تھیں۔یہ میٹھی یادیں اس کے دل پر ٹھنڈی پھوار بن کر گرتیں۔امنگیں جوان ہو جاتیں، گالوں کے گلاب کھل جاتے اور وہ خیالوں میں ہی شرما جاتی۔ پھوٹری دل جمعی سے کام کرتی باقاعدگی سے پیسے گھر بھجواتی 100 روپیہ کی بچت کرتی، گھر کے حالات سدھرنے لگے۔باپو کا علاج ہونے لگا پھوٹری نے بھی اپنی حسرت پوری کی اور سارے زیور خرید لیے۔لیکن یہ اچانک کیا ہوا؟ خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔ ہر نفوس حیرت وخوف کے سائے میں، پوری دنیا میں ہاہا کار مچ گیا۔ ہر جگہ تالا منھ چڑھانے لگا۔ روزی روزگار ختم ہو گئے۔اوپر والے نے اپنے گھر کے دروازے بند کر دیے انسان کو اس کو اوقات بتا دی، کتنی بھی آسمان پر کمند ڈال دے لیکن

ہے تو وہی لاچار و بے بس بندہ۔ لاک ڈاؤن کا اعلان انسان قید اور چرند پرند آزاد۔ غریب مزدور جائیں تو جائیں کہاں؟ مجبور ہو کر اپنے آشیانوں کی طرف پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ سامان اور بچوں کو دوش پر اٹھائے کوس درکوس منزل درمنزل چلنا چلنا مدام چلنا۔ بھوکے پیاسے، پیروں میں آبلے ہونٹوں پر خشکی، آنکھوں کے گرد حلقہ۔ بھوک کی تاب نہ لاکر اس بے رحم دنیا سے کوچ کر گئے۔ پھوٹری کا حسن کمھلا گیا اس کے چہرے کی سرخی میں زردی گھل گئی۔ اپنے وجود کو لے کر چلنا ہی دشوار تھا لیکن پھوٹری اس ٹین کے صندوق کو کاندھوں پر اٹھائے چلی جارہی تھی، اس صندوق میں اس کے ارمان تھے آرزوئیں تھیں۔ انھیں کے سہارے تو وہ یہ پر خار راستہ طے کر رہی تھی۔ کئی دلخراش منظر درپیش آئے ہمت جواب دے گئی لیکن اپنے گھر کی ٹھنڈی چھاؤں کی آس وامید نے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا۔ ایک دن اللہ کے کچھ بندوں کو رحم آ گیا انھوں نے کھانے اور پانی کے پیکٹ تقسیم کیے، یہ منظر خواب سے کم نہیں تھا، بھوکے پیاسے لوگ ایسے ٹوٹ پڑے کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ کسی کسی نے اتنا کھا لیا کہ ہاضمہ خراب ہو گیا پہلے بھوک سے مر رہے تھے اب کھانے سے مر گئے۔

پھوٹری کی چپل بھی کب تک ساتھ دیتی اس نے بھی دم توڑ دیا۔ کئی لوگ پھوٹری کی طرح ننگے پیر راستہ عبور کر رہے تھے۔ پتھریلی کولتار کی سڑک پر پیروں میں چھالے۔ آنکھوں میں جلن، سر پر دھوپ کی تمازت لیے چلے جارہے تھے۔ ابھی آزمائشیں ختم کہاں ہوئی تھیں، صوبے کی سرحد پر روک دیا گیا منزل کے قریب پہنچ کر بھی منزل سے دور تھے۔ پھوٹری اپنی جان سے زیادہ پیارے صندوق پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ راستے بھر اس نے اس صندوق کی حفاظت کی تھی۔ کچھ لوگ آکر پریشان حال لوگوں کے لیے کھانا چپلیں بانٹ رہے تھے لیکن اب پیر اتنے زخمی ہو چکے تھے کہ چپل پہننا دشوار تھا۔ 5 دن بعد ان بدنصیب پریشان حال لوگوں کو صوبہ سرحد میں جانے کی اجازت ملی۔ کارواں پھر رواں دواں ہو گیا۔ راستے میں ایک عورت کو زچگی ہوئی بچہ کا نام لاک ڈاون رکھا گیا۔ مرجھائے ہوئے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آخرکار پھوٹری کا قافلہ بھی اپنے گاؤں کی سرحد پر پہنچا لیکن ابھی بھی امتحان باقی تھے یہاں سرپنچ نے حد بندی کر رکھی تھی یہاں پہلے سب کا کورونا ٹیسٹ ہوا اس کے بعد گاؤں میں داخلہ ہوا۔ آخرکار اس لٹے پٹے قافلے نے اپنے گھر کی دہلیز کو چوم کر اندر قدم رکھا، اپنا گھر اپنا سائبان کتنا سکون تھا۔ پھوٹری کے باپ بھائی نے اس گرم جوشی سے خیر مقدم نہیں کیا جس طرح ماں نے کیا۔ پھوٹری نے سب کو خوشی خوشی اپنے کپڑے زیورات دکھائے ماں تو خوش ہو گئی کہ گونے میں کام آجائیں گے۔ لیکن باپو اور بھائی خوش نہیں ہوئے۔ اپنی سہیلیوں کو بھی اسی نے شوق سے سارا سامان دکھایا ان کی آنکھوں میں بھی ایسی اشیاء کی خواہش انگڑائیاں لینے لگیں۔۔ پھوٹری کو رمیشیا بہت یاد آتا لیکن مجبوری۔ پھوٹری خیالوں میں ہی اپنی پسندیدہ پوشاک و زیورات پہن کر اس سے روز ملتی۔ روز وہ اپنے صندوق کو کھول کر دیکھتی اور حسین خوابوں کی وادیوں میں سیر کرتی۔

”پھوٹری کی چپل بھی کب تک ساتو دیتی اس نے بھی دم توڑ دیا۔ کئی لوگ پھوٹری کی طرح ننگے پیر راستہ عبور کر رہے تھے۔ پتھریلی کولتار کی سڑک پر پیروں میں چھالے۔ آنکھوں میں جلن، سر پر دھوپ کی تمازت لیے چلے جارہے تھے۔ ابھی آزمائشیں ختم کہاں ہوئی تھیں، صوبے کی سرحد پر روک دیا گیا منزل کے قریب پہنچ کر بھی منزل سے دور تھے۔ پھوٹری اپنی جان سے زیادہ پیارے صندوق پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ راستے بھر اس نے اس صندوق کی حفاظت کی تھی“

پھوٹری نیم کے نیچے بیٹھی اپنی سہیلیوں کو شہر کی باتیں سنا رہی تھی کہ اس نے دیکھا ماں آنچل میں کچھ چھپائے سرپنچ کے گھر کی طرف جا رہی ہے۔ شام کو دو دن بعد چولھا جلا، روٹی کی سوندھی مہک سے سب کے چہرے کھل گئے سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ رات کو جب پھوٹری نے اپنا صندوق کھولا تو اس کا قیمتی اثاثہ غائب تھا۔ پھوٹری سارا ماجرا سمجھ گئی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر ماں دوڑی آئی اس نے بیٹی کو گلے لگایا اور دونوں ماں بیٹی زاروقطار رونے لگیں۔ پھوٹری کے خواب، حسرتیں، آرزوئیں، تمنائیں ان آنسوؤں میں بہہ گئے۔

□□□

Dr. Farkhanda Zamir,
Arbab Mantion
H.N.805/13
Azad Nagar, Khanpura
Ajmer-305002 (Rajasthan)

ہاجرہ خاتون

# بین کرتی تین نظمیں

(1)

ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی راتوں میں
کچے آنگن کی مٹی پر
چلتے ہوئے ننگے پاؤں
میں سوختہ جاں بے اماں
یادوں کے طلسم میں سرگرداں
پرچھائیاں دیکھتی رہتی ہوں
اور آہٹ سنتی رہتی ہوں
آواز تو دو
تم یہیں کہیں......
مجھ میں تو نہیں!!

(2)

سرد اکیلی راتوں میں
دھند گھنیری شاموں میں
کہرے جیسی باتوں میں
بیتی رتوں کے سائے میں
مرے اندر تم روتے ہو
کہاں ہو تم آواز تو دو
تم یہیں کہیں ہو
مجھ میں تو نہیں!!

(3)

ہر آتے جاتے موسم میں
آہٹ میں تمھاری سنتی ہوں
سب باتیں تمھاری کرتے ہیں
الزام بھی تم پر منڈھتے ہیں
میں لب سی کے رہ جاتی ہوں
کہاں ہو تم آواز تو دو
خاموش کیوں ہو جواب تو دو

## ادراک

وہ چلا گیا تو میں نے جانا
کہ ہوائیں کیسے بین کرتی ہیں
اور فضا کیسے ساکت ہو جاتی ہے
تھکن لپٹ جاتی ہے جسم و جاں سے
کیوں روح مضمحل سی ہو جاتی ہے
وہ چلا گیا تو میں نے سمجھا
کیوں بار خاطر تھے مجھ پر
کشمکش میں گزرے ہوئے لمحے
روح گھٹن کا اعلان کر رہی تھی
دراصل
خواب اور حقیقت کے پل صراط پر کھڑی میں
خود سے لڑتے لڑتے
بکھر چکی تھی

**Hajra Khatoon**
1C Zuleikha Enclave,
Near Doranda College, Parastoli,
Doranda, Ranchi-834002

کائنات بخشی

# عہد نو کا راہرو

مرے محسنوں سے کوئی پوچھے
کہ ان کا احسان
مری تباہی کا پیش خیمہ بنے تو کیا ہو
کوئی بگولہ مجھے اڑائے پھرے تو کیا ہو
مرے عزیزوں سے کوئی کہہ دے
کہ ان کی چاہت
مرے ارادوں کو ڈس رہی ہے
مری زندگی کی شوخیوں کو جھلس رہی ہے
مرے دلبروں سے کوئی کہہ دے
کہ ہنستے ہنستے
گلوں کا رنگیں فریب دے کر
نہ میری راہوں میں خار بوئیں
مرے مہرباں سے کوئی کہہ دے
کہ تن بہ تنہا
مجھی کو اک روز اپنا مستقبل درخشاں بنانا ہوگا
نہ جانے کتنی صعوبتوں کو گلے سے اپنے لگانا ہوگا
مرے دوستوں سے کوئی کہہ دے
کہ عہد نو کا میں راہرو ہوں
مجھے مرے حال پہ چھوڑ دیں
وہ کہاں تلک میرا ساتھ دیں گے

**Kainat Bakhshi**
861,2nd Floor,
Opp. Kashanae Nusrat
Opp.Salahuddin Ayyubi School And College
Bhiwandi-421302 (M.S)

## سوجی پیٹھا یا سوجی کے رس گلے

**اشیا:** دودھ آدھا لیٹر، سوجی ¼ کپ (50 گرام)، چینی 25.1 کپ (300 گرام)، ماوا ¼ کپ (60 گرام)، چینی پاؤڈر دو بڑے چمچ (25 گرام)، بادام کے ٹکڑے 1 بڑا چمچ، الائچی 4، گھی 2 بڑے چمچ، پستہ ایک بڑا چمچ، کیسر کے دھاگیں 10-12،

**ترکیب:** چاشنی بنانے کے لیے ایک بڑے برتن میں 3/4 کپ چینی اور 1 کپ پانی ڈال کر چینی کو پانی میں گھلنے تک تیز آنچ پر پکا لیجیے۔ چینی گھل جانے پر اس میں 10-12 کیسر کے دھاگے ڈال کر تھوڑی دیر پکا لیجیے۔ چاشنی کے ہلکا گاڑھا ہو جانے پر آنچ کو بند کر دیجیے اور چاشنی کو ہلکا ٹھنڈا ہونے دیجیے۔

سوجی کا پیٹھا بنانے کے لیے ایک پین میں 2 بڑے چمچ گھی ڈال کر گرم کر لیجیے۔ گھی گرم ہو جانے پر اس میں ¼ کپ سوجی ڈال کر چلاتے ہوئے 2 منٹ تک بھون لیجیے۔ 2 منٹ بعد سوجی میں ½ لیٹر دودھ ڈال کر گاڑھا ہونے تک چلاتے ہوئے پکا لیجیے۔ سوجی کے اچھے سے گاڑھا ہو جانے ہو پر اس میں ¼ کپ چینی ڈال کر چلاتے ہوئے پکا لیجیے۔ چینی کے پوری طرح حل ہو جانے پر آنچ کو بند کر کے ڈو کو ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیجیے۔

اسٹفنگ بنانے کے لیے ایک پین میں ¼ کپ ماوا توڑ کر ڈال

دیجیے اور اسے چلاتے ہوئے ایک منٹ تک بھون لیجیے۔ ماوا میں سے گھی الگ ہو جانے پر اس میں ایک بڑا چمچ بادام کے ٹکڑے، ایک بڑا چمچ پستہ، چار چھوٹی الائچی کے بیج ڈال کر تمام اشیا کو ملاتے ہوئے بھون لیجیے۔ اسٹفنگ کے بھن جانے پر اسے ایک پلیٹ میں نکال کر ہلکا ٹھنڈا ہونے رکھ دیجیے۔ اسٹفنگ کے ہلکا ٹھنڈا ہو جانے پر اس میں 2 بڑے چمچ چینی پاؤڈر ڈال کر ملا دیجیے۔

اسٹفنگ میں چینی مل جانے پر اس میں سے چھوٹی چھوٹی گیند بنا لیجیے۔ اب ہاتھ پر ہلکا سا گھی لگا کر سوجی کے ڈو میں سے تھوڑا سا ڈو ہاتھ پر لے کر اسے گول کر کے کٹوری جیسا شیپ دے کر ایک اسٹفنگ کی گیند سوجی کے ڈو میں رکھ کر بند کر دیجیے۔ اسٹفنگ بند کر کے ڈو کو دونوں ہتھیلیوں سے گول شیپ دے دیجیے اور چاشنی میں ڈال دیجیے۔ اسی طریقے سے سوجی کے ڈو میں اسٹفنگ بھر کر چاشنی میں ڈال دیجیے۔ سوجی کی اسٹفنگ پیٹھا بن کر تیار ہے آپ انھیں تقریباً ایک گھنٹے تک چاشنی میں رہنے دیجیے اور پھر اسے سرو کیجیے یہ کھانے میں بہت ہی لذیذ ہوتے ہیں۔

مشورہ: آپ ماوا کی جگہ مونگ کی دال یا پھر ڈرائے فروٹ کی اسٹفنگ بھی لے سکتے ہیں۔

**مصالحہ بڑا**

**اشیا:** چنا دال - 1 کپ (200 گرام)، ہری مرچ - 4 یا 5، ادرک - 1 انچ کا ٹکڑا، پتا گوبھی - 1 کپ (گرائنڈ کر لیں)، نمک - 1 چھوٹا چمچ، لال مرچ (کٹی) - 1 چھوٹا چمچ، دھنیا پاؤڈر - 1 چھوٹا چمچ، زیرہ - ½ چھوٹا چمچ، گرم مصالحہ - ¼ چھوٹا چمچ، ہرا دھنیا - 1 بڑا چمچ، بیسن - ½ کپ (100 گرام)

**ترکیب:** مصالحہ بڑا بنانے کے لیے سب سے پہلے ایک کپ چنا دال کو چار سے پانچ گھنٹے پانی میں بھگو کر رکھ دیجیے۔ اب مکسر جار میں چار سے پانچ ہری مرچ اور ایک انچ ادرک کا ٹکڑا ڈال کر اسے پیس لیجیے۔

مرچ اور ادرک پیسنے کے بعد اس میں ½ کپ چنا دال ڈال کر دردرا پیس لیجیے (دال کو بنا پانی ڈالے ہی دردرا پیسنا ہے)۔

پسی ہوئی دال کو کسی باؤل میں نکال لیجیے اور اس میں بچی ہوئی ثابت دال ملا لیجیے۔ اب دال میں ایک کپ گرائنڈ پتا گوبھی، 1 ایک چھوٹا چمچ نمک، ایک چھوٹا چمچ کٹی ہوئی لال مرچ، ایک چھوٹا چمچ دھنیا پاؤڈر، ½ چھوٹا چمچ زیرہ، ¼ چھوٹا چمچ گرم مصالحہ اور ایک سے دو بڑا چمچ ہرا دھنیا ڈال کر اچھے سے ملا دیجیے۔

اب بائنڈنگ کے لیے مکسچر میں ایک کپ بیسن ڈال کر ملا لیجیے (آپ چاہیں تو بیسن کی جگہ سوجی یا چاول کا آٹا بھی لے سکتے ہیں)۔

اب مکسچر کی چھوٹی چھوٹی لوئی لے کر بڑے بنا لیجیے (بڑے بناتے وقت ہاتھ میں تیل لگا لیجیے اس سے مکسچر ہاتھ میں نہیں چپکے گا)۔

اس طرح سارے بڑے بنا کر ایک طرف رکھ لیجیے (آپ بڑے اپنے مطابق چھوٹے یا بڑے بنا سکتے ہیں)۔ بڑوں کے تلنے کے لیے ایک کڑھائی میں تیل گرم کر لیجیے اور میڈیم ہائی فلیم پر بڑوں کو گولڈن براؤن اور کرسپی ہونے تک تل لیجیے (آپ چاہیں تو ڈیپ فرائی بھی کر سکتے ہیں)۔

گرما گرم کرسپی بڑے بن کر تیار ہیں۔ اسے آپ چاہیں تو ہری چٹنی یا ٹمیٹو ساس کے ساتھ سرو کر سکتے ہیں۔

مشورہ: دال کو دردرا ہی پیسنا ہے تبھی بڑے کرسپی بنیں گے۔ دال پیستے وقت اس میں پانی نہ ملائیں۔ تیل کو گرم کرتے وقت چاہیں تو فلیم ہائی کر سکتے ہیں لیکن بڑوں کو تلتے وقت فلیم کو میڈیم ہی رکھیں۔

(بحوالہ: www.nishamadhulika.com)

ڈاکٹر سید محمد عباس رضوی

# سن یاس
# Menopause

یہ زندگی کا وہ دور ہے جبکہ جنسی نظام میں Regression شروع ہوتا ہے یہ دور کئی سال تک رہتا ہے۔ اس کی مدت مختلف عوتوں میں مختلف ہوتی ہے۔ اس کی خاص علامت طمث اور صلاحیت تولید کا ختم ہو جانا ہے لیکن اس کے باوجود بھی نہ تو جسمانی حالت میں کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ جنسی خواہشات میں۔ بلکہ اس کے بعد بھی کئی سال تک ازدواجی زندگی کا حظ حاصل کرنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔ سن یا شروع ہونے کا وقت عموماً 45 اور 50 سال کے درمیان ہے۔ مختلف حالات میں یہ عمر کم زیادہ ہو سکتی ہے۔ اگر 50 سال کی عمر کے بعد بھی طمث نہ رکے تو ایسی حالت میں Endometrial Hyperplasia Fibrod- Myomata جسم رحم کے کینسر یا بیض کے Granulosa Cell Tumour کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ اگر عانہ ہونے والے کسی رمض کے علاج کے سلسلے میں Raido Therapy دی گئی ہو یا Hysterectomy کی گئی ہو تو سن یاس کی علامتیں قبل از وقت بھی شروع ہو سکتی ہیں۔

بیض کے افعال کی ایک محدود مدت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس دور میں بیض پر Gonadotrophin کا اثر بتدریج کم ہوتا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بھی بعض عورتوں میں تبویض کے ختم ہونے کے بعد بھی طمس کئی مہینے تک ہو سکتا ہے۔ جب بیض پر F.S.H کا اثر بالکل ختم ہو جاتا ہے تو طمث رک جاتا ہے اور اس وقت بیض عملی طور پر بیکار ہو جاتی ہے۔ خورد بینی معائنہ کرنے پر Atretic Follicle صرف کہیں کہیں نظر آتے ہیں Cortex پتلی ہو جاتی ہے اور نسیج الحاق connective Tissues کے بڑھ جانے کی وجہ سے Medulla نسبتاً دبیز ہو جاتی ہے۔ عروق دمویہ سخت ہو جاتی ہیں۔

قدامی نخامیہ کے Gonabotrophin کا ترشح اب بیض کے کنٹرول میں نہیں ہوتا۔ قدامی نخامیہ کے افعال میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ سن یاس کے بعد عورتوں میں F.S.H اور L.H. کی زیادتی کافی نمایاں ہوتی ہے جو کئی سال تک باقی رہتی ہے اس کے ساتھ ساتھ Adrenocotrico- Trophic اور Thyro-Trophic Function بھی بڑھ جاتے ہیں۔ ان زمانہ میں غدہ درقیہ اور مجاد وکلیہ (Adrenal) کے افعال کی زیادتی کے نتیجے میں مختلف قسم کے نفسیاتی عوارض پیدا ہوتے ہیں جن کا انحصار عورت کے ماضی میں رہنے والے جذباتی توازن اور سماجی حالات پر ہوتا ہے۔ لیکن وہ عورتیں جو اپنے ماحول میں اپنے آپ کو اچھی طرح Adjust کیے ہوئے ہوتی ہیں ان پر اس تبدیلی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو بہت کم۔ لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ نچلے طبقے کی عورتیں اعلیٰ سوسائٹی کی عورتوں کی بہ نسبت کم متاثر ہوتی ہیں۔

آخر میں قدامی نخامیہ کے افعال کی زیادتیAdrenal Cortex کے ذریعہ ختم ہو جاتی ہے۔Adrenal Cortex سے مترشح ہونے والاAndrogen اور دوسرے جنسیSteroid بیض سے مترشح ہونے والے جنسیSteroid کی جگہ لے لیتے ہیں اور اس طرح سے قدامی نخامیہ کے عمل کا توازن پھر سے قائم ہو جاتا ہے۔

### سن یاس میں ظاہر ہونے والی علامات

#### طمث

بعض عورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ طمث یکبارگی رک جاتا ہے ورنہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ طویل وقفہ کے ساتھ زرد رنگ کا معمولی اخراج ہوتا ہے۔ بعض عورتوں میں تھوڑے وقفہ کے بعد خفیف یا کئی دنوں تک اخراج ہوتا ہے۔ بعض میں شدید قسم کا اخراج ہوتا ہے۔ لیکن ان کے درمیان غیر منظم وقفہ ضرور ہوتا ہے۔

#### قلب واعصاب کی کیفیت

بعض عورتوں کا ضغط الدم(B.P) زیادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ یہ علامت ترکیبی ہی ہوتی ہو اور موجودہ حالات سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو بعض عورتوں میں اسرع القب(Tachycardia) کی شکایت ہوتی ہے جو قلب کے عضوی امراض یا غدہ درقیہ(Thyroid) کے افعال کی زیادتی کے نتیجے میں ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ علامت 'Hot Flus' ہے ایسی حالت میں عورت یکبارگی حرارت محسوس کرتی ہے۔ اس کا بدن سرخ ہو جاتا ہے۔ پھر چند لمحوں کے بعد پسینہ آ کر تھوڑی دیر کے لیے اس کا جسم ٹھنڈا چپچپا اور لیسدار ہو جاتا ہے۔ دن میں یہ صورت کئی بار بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن جب یہ کیفیت رات میں ہوتی ہے تو اس سے نیند میں بھی خلل پڑتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ صورت اس عورت کے خون میں F.S.H کی زیادتی کے نتیجے میں ہوتی ہے۔

#### حکۃ الفرجPruritus Vulva

بہت سی عورتیں اس دور میں جذباتی خلل کا شکار ہو جاتی ہیں۔ وہ مضطرب اور خوف زدہ رہتی ہیں۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ معتبر اور سمجھدار عورتیں بھی اس عمر میں گھبرائی ہوئی اور چڑچڑی ہوتی ہیں۔ شدت کی صورت میںMelancholia یا جنوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ بعض عورتوں میں خودکشی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے اور ان میں اپنے معاملات کی دیکھ بھال کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رہ جاتی۔

#### حمل کاذب (رجاء) Pseudocyesis

یہ صورت بہت کم ہوتی ہے اور ان ہی عورتوں میں ہوتی ہے جنھیں اولاد نہیں ہوتی اور وہ اس کے لیے بے قرار رہتی ہیں اور یہی خواہش انھیں اس مرض میں مبتلا کر دیتی ہے۔ احتباس طمث یا قلت طمث کے ساتھ اگر اس دور میں بطن کی دیواروں میں شحمی اجزا اکٹھا ہونے لگیں تو ان کے شک کو اور بھی تقویت پہنچتی ہے اور وہ یہ یقین کر لیتی ہیں کہ وہ حاملہ ہو گئی ہیں۔ جب اس حقیقت کا علم ہوتا ہے تو وہ اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتیں اسے یقین کرانے کے لیے متعدد بارBiological Test کرانا پڑتا ہے۔

#### بے خوابی (Insomnia)

یہ شکایت اکثر ہو جایا کرتی ہے اور رات میں بار بار 'Hot FlusH' ہونے کے نتیجے میں اس میں اور بھی شدت آ جاتی ہے۔

#### سر درد

سر درد اعصابی تناؤ کے نتیجے میں ہوتا ہے جو بعض اوقات سر کے قدامی حصہ اور بعض اوقات گردن کے پچھلے حصے تک محسوس ہوتا ہے اور بعض اوقات پورے سر میں ہوتا ہے۔

#### استحالی عوارض (Metabolic Symptoms)

عام طور پر سمن مفرط(Obesity) ہی سب سے اہم علامت ہوتی ہے۔ بعض عورتوں کا وزن سن یاس کے دوران چند پاؤنڈ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن بعض عورتوں کا وزن بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔

### سن یاس کے دوران ضروری احتیاط وتدابیر

عورت کی تندرسی کا دھیان رکھا جائے۔ اگر وزن تیزی سے بڑھ رہا ہو تو اس کا تدارک ضروری ہے۔ نیند اور آرام کی طرف بھی دھیان دیا جائے۔ گھریلو معاملات جو تشویش وترددا اور اضطراب کا سبب بنتے ہیں ان سے بچایا جائے۔

تعلیم یافتہ عورتوں کو عمر کے اس دور میں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اب وہ سن رسیدہ ہو چکی ہیں۔ معالج اس معاملہ میں ان کی کافی مدد کر سکتا ہے۔ انھیں یہ یقین دلانا چاہیے کہ اس دور کے شروع ہونے پر جنسی زندگی اور گھریلو خوشیوں کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ انھیں یقین دلایا جائے کہ وہ جذباتی استحکام کو اعتماد کے ساتھ کنٹرول کرے۔ ان عورتوں کو ایسٹروجن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرفTranquilisers استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کی خوراک دھیرے دھیرے کم کرتے رہنا چاہیے۔ جب ذہنی کیفیت اعتدال پر آ جائے تو پھرTranquilisers نہیں دینا چاہیے۔

**(نسائیات، ڈاکٹر سید محمد عباس رضوی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، سن اشاعت دوم1999)**

# حسن کی نگہداشت

**موسم سرما میں ایک بار چہرے کا رنگ صاف کرنے والا یہ فیس واش بنا کر رکھ لیں اور روزانہ استعمال کریں، تاکہ ہو آپ کی جلد صاف اور نرم وملائم گھر بیٹھے**

آج کل جلد صرف خشک یا بے رونق نہیں بلکہ ڈیڈ اسکن سیلز کی وجہ سے بہت زیادہ خراب ہونے لگی ہے اور کھال اتر کر جلد میں نمی بھی بہت زیادہ آنے لگی ہے، جانیں ایسا شاندار کھیرے کا فیس واش بنانے کی ترکیب جو اس موسم میں آپ کی خوبصورتی کو بڑھانے کا کام کرتا ہے اور کھلے مساموں میں موجود گندگی کو بھی صاف کرنے میں مدد دیتا ہے۔

ٹپ:

• ایک کھیرے کو اچھی طرح دھولیں۔

• اس کے سلائس کاٹ کر اس کو بلینڈر میں ڈالیں اور ساتھ ہی ایک چمچ لیموں کا رس اور آدھا چمچ چائے کی پتی شامل کریں اور بلینڈ کرلیں۔

• اب اس کو ایک بوتل میں محفوظ کرلیں۔

• لیجیے تیار ہے آپ کا زبردست اور سستا فیس واش۔

• جب بھی منہ دھوئیں اسی فیس واش سے دھوئیں اور رنگ بھی نکھار لیں۔

فائدہ: کھیرے میں بھرپور فائبر، کاربس، پروٹین، وٹامن سی، کے اور بی، پوٹاشیم، میگنیز، آئرن، زنک رائبوفلوین اور میگنیشیم کے ساتھ ساتھ جلد کو اپ لفٹ کرنے والے لائیکٹرلائٹس شامل ہوتے ہیں جو جلد کے مسائل یعنی رنگ صاف کرنے، خراب جلد کو نرم وملائم بنانے اور ایکنی کے مسئلے کو کنٹرول کرتا ہے، جبکہ چائے کی پتی میں موجود تھیوبرومائن اور تھیوفیلائن جلد کی خشکی کو ختم کرنے اور جھائیوں کو کنٹرول کرنے میں مدد دیتا ہے۔

**اکثر خواتین کو جسم کے مختلف حصوں میں یہ دانے کیوں ہوتے ہیں جانیں ان کو ختم کرنے کا آسان طریقہ جو ہر عورت کو معلوم ہونا چاہیے**

اکثر گھریلو خواتین اپنی صحت کو نظر انداز کر دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے جسم میں مختلف قسم کی بیماریاں اور تکلیف دہ دانے بھی ہوجاتے ہیں جس کو وہ بتانے سے گھبراتی ہیں یا پھر غور نہیں کرتیں اور یہی دانے وقت گزرنے کے ساتھ بڑے ہوجاتے ہیں یا پھر ہر ماہ نکل آتے ہیں اور اندر ہی اندر تکلیف کا باعث بنتے ہیں کیونکہ ان جگہوں پر خارش اور سوزش بھی ہوتی ہے۔

**وجہ اور آسان حل:**

**پیٹ کے نچلے حصے میں:** پیٹ کے نچلے حصے میں نکلنے والے دانے عموماً خاص ایام کے بعد نکل آتے ہیں۔

**حل:** اس کا حل یہی ہے کہ جسم کو صاف رکھیں، پانی سے ہر ایک گھنٹے بعد دھوئیں، معیاری پیڈز اور لوشن کا استعمال کریں۔

**بالوں کی صفائی:** غیر ضروری بالوں کی صفائی کے بعد بھی یہ دانے نکل آتے ہیں جس کی وجہ غیر معیاری پراڈکٹ کی ریموونگ کریم یا شیور ہوتے ہیں جو کہ لیڈ سلفیٹ کی وجہ سے دانے پیدا کر دیتے ہیں۔

**حل:** اچھے پراڈکٹس کی ریموونگ کریم کا استعمال کریں اور میڈیکیٹڈ شیور ہی استعمال کریں تا کہ ان دانوں سے بچ سکیں۔

**ہونٹوں اور ناک کے درمیان دانہ:** ہونٹوں اور ناک کے درمیان اکثر چھوٹے اور سخت دانے نکل آتے ہیں جو سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ گندے پانی کا استعمال کرنا ہوتا ہے۔

**حل:** گندے پانی کا استعمال نہ کریں اور واش روم جاتے وقت پانی خیال سے استعمال کریں تا کہ نجاست اور گندگی بھی نہ ہو اور دانے بھی نہ نکلیں۔

**ٹھوڑھی کے نیچے دانہ:** ٹھوڑھی کے نیچے اور اطراف میں نکلنے والے دانے ہارمونل تبدیلیوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

**حل:** ان کو ختم کرنے کے لیے ہلدی والا دودھ پینا آپ کی صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔

نوٹ: یہ ایک عام معلومات ہے مزید معلومات کے لیے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

**چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہوں یا بالوں کا مسئلہ ہو، لیموں پر کالی مرچ چھڑک کر بتائے گئے طریقے سے استعمال کریں اور چند ہی دنوں میں نظر آئیں خوبصورت**

لیموں خواتین کو بہت پسند ہوتا ہے کیونکہ یہ بات تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ لیموں کھانے میں ذائقے کے لیے ہو یا پینے کے لیے، بیوٹی کے لیے ہو یا صحت کے لیے اس کے بے شمار استعمال اور فوائد ہیں۔

لیموں اور کالی مرچ کو ایک ساتھ بتائے گئے طریقے سے استعمال کریں اور اپنے مسائل کو حل بھی سستے میں کرنے کی آسان سی ٹپس جان لیں کیونکہ یہ بہت زیادہ فائدہ مند بھی ہیں۔

**فائدہ:** لیموں میں وٹامن اے، وٹامن سی، فاسفورس، کیلشیم، پوٹاشیم اور اسٹرک ایسڈ پایا جاتا ہے جو کہ آپ کی بیوٹی اور صحت دونوں کے لیے فائدہ مند ہے اور کالی مرچ میں وٹامن اے 10% وٹامن سی 35%، وٹامن ای 30%، سوڈیم 3%، پوٹاشیم 27%، کیلشیم 44%، آئرن 36%، فاسفورس 25%، زنک 13% اور میگنیشیم 5.48% موجود ہے جس کو مصالحوں کی ملکہ بھی کہا جاتا ہے۔

**مسائل اور ٹپس:**

**☆برص کے نشانات:**

برص کی بیماری جلد میں میلانن کی کمی کی وجہ سے ہوجاتی ہے اور اس کی وجہ سے چہرہ خراب لگتا ہے کہیں سے سفید تو کہیں سے براؤن جلد۔ اگر آپ بھی اس سے بچنا چاہتی ہیں تو لیموں کو کاٹ کر دو پیس کریں اس پر کالی مرچ چھڑکیں اور چہرے/ جلد پر مساج کر لیں۔ لیجیے آسان اور انتہائی کارآمد ٹپ ہے۔ ڈرمیٹالوجیکل ریسرچ آف پینسلین کی رسرچ کے مطابق: لیموں اور کالی مرچ کا استعمال اس بیماری کو کنٹرول کرنے میں بہت فائدہ مند ہے۔

**☆جھریاں:**

روزانہ صبح کے وقت لیموں پر کالی مرچ ڈال کر مساج کریں اور پائیں زبردست نتائج۔

**☆خشکی سے پاک بال:**

سردیوں میں خشکی کے مسائل حد سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں اور بالوں میں اتنی زیادہ خشکی ہوجاتی ہے کہ پیشانی پر بھی نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن لیموں اور کالی مرچ کی یہ ٹپ آپ کو ضرور فائدہ دے گی۔ کالی مرچ سے آپ کو جلن ضرور ہوگی مگر خشکی کے ذرات بھی آہستہ آہستہ جھڑ جائیں گے۔

تو اب سے لیموں اور کالی مرچ کا استعمال کریں اور پائیں ایسا فائدہ جو آپ کو بھی خوبصورت بنا دے۔

(بحوالہ: www.hamariweb.com)

□□□

# تاثرات: نگر نگر سے

ماہنامہ 'خواتین دنیا' کا شمارہ (نومبر 2020) نظر نواز ہوا۔ سرِ ورق خواتین کے اتحاد، ان کی طاقت اور روشن ہوتی مقدر کی گلیوں کا استعارہ ہے جہاں تاریکی سے روشنی کی جانب خواتین کے بڑھتے قدم کی راہوں میں اداریہ ''مشعل'' کی صورت کام کر رہا ہے۔ فہمیدہ ریاض پر ڈاکٹر مسرت کا مضمون کوزہ میں سمندر سمیٹنے کے مترادف ہے۔ سیدہ فرحت کے منتخب دونوں اشعار خوب لگے۔ ڈاکٹر رئیسہ پروین کا مضمون ''اقبال اور پیامِ مشرق'' قابل توجہ ہے جس کو بہت حسین پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ اقبال کے ساتھ المیہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کے لیے انھوں نے لکھا ان لوگوں نے ان کو اس نکتہ نگاہ سے پڑھ کر سبق حاصل نہیں کیا۔ جب کہ جن لوگوں نے ان کو غور سے پڑھا انھوں نے یہ کہہ کر ان کی شاعری سے انکار کیا کہ یہ صرف ایک مخصوص قوم کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کو اس بات کا قلق رہا کہ ان کے ہمعصر گوئٹے کو ایک ترقی یافتہ، آزاد خو، سربلند اور تعلیم یافتہ قوم ملی جب کہ ان کو ایک ایسی قوم سے سابقہ پڑا جو اس سے ناواقف تھی کہ ہیرے کی پرکھ کیسے کی جاتی ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں میں عشرت معین سیما ایک نمایاں نام ہے۔ ڈاکٹر شاہد الرحمٰن نے ان کے ادبی ذوق کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے جس میں موصوفہ کے افسانوں کے ہر پہلو کو اجاگر کرنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ صاحب مضمون کے اس خیال سے میں اتفاق کرتا ہوں کہ جو ادیب اپنے ماحول سے غافل ہو کر ادب کی تخلیق کرتا ہے اس کا ادبی اعتبار قائم نہیں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تسنیم فاطمہ کا مضمون ''تانیثیت اور اردو افسانہ'' میں تشنگی کا احساس ہوا کیونکہ اس موضوع کا احاطہ بہت وسیع ہے۔ ویسے پیشکش اچھی ہے۔ مہوش نور کا مضمون جرمنی میں اردو ادب کے فروغ میں متحرک خواتین افسانہ نگاروں سے مختصر لیکن جامع تعارف کرواتا ہے۔ اس خطے میں ہما فلک کافی سرگرم افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے روح کی گہرائی تک اتر جاتے ہیں۔ عالمی افسانہ فورم پر میں موصوفہ کے متعدد افسانے کو پڑھتا ہوں ان کے افسانے بہت پرتاثیر ہوتے ہیں۔ محمد رکن الدین کا تبصراتی مضمون عمدہ ہے۔ محمد انصر صاحب نے بھی خوب لکھا ہے۔ رسالے میں شامل دونوں افسانوں میں غزالہ قمر اعجاز کا افسانہ زیادہ پرتاثر ہے۔ نظم ''خامشی'' میں زمین کی بے بسی کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر بشریٰ اشرف کا مضمون انفرادیت کا حامل ہے۔ لذیذ پکوان میرے حصے کی چیز نہیں ہے۔ المختصر یہ شمارہ صدا دیتا ہے کہ ہم کو آتا ہے کوزے میں سمندر کو سمونا۔۔!!

لفظ قیدی نہیں ہوتے،
ہوا کے سنگ پھرتے ہیں،
سدا آزاد رہتے ہیں۔!

**ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی** (جگتدل، بنگال)

□□□

## زرین خان نے سی اے کے امتحان میں اول مقام حاصل کیا

ممبرا: زرین محمد یوسف خان نے تاریخ رقم کرتے ہوئے نہ صرف 'دی انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس (سی اے) آف انڈیا' کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے بلکہ مسلم کمیونٹی کے لیے مشعل راہ بھی ثابت ہوئی ہیں۔ انھوں نے اس مشکل امتحان میں پورے ہندوستان میں اول مقام حاصل کرتے ہوئے نہ صرف اپنے والدین، اہل خانہ، رشتہ داروں اور دوستوں کو فخر کرنے کا موقع دیا ہے بلکہ اہل ممبرا کے لیے بھی مثال ثابت ہوئی ہیں۔ زرین کی اس بہترین کارکردگی سے نہ صرف ممبرا بلکہ تھانے ضلع اور مہاراشٹر کا نام بھی روشن ہوا ہے جس کی وجہ سے پورے علاقے میں خوشی کا ماحول ہے۔ زرین ممبرا ریلوے اسٹیشن کے سامنے واقع رضوی باغ کی ایف ونگ میں پہلی منزل پر کرایہ کے چھوٹے سے مکان میں اپنے والد اور دو بھائیوں اور ایک بہن کے ساتھ رہتی ہیں۔ زرین کے والد ایک پرائیویٹ گیراج میں ملازمت کرتے ہیں جبکہ والدہ خاتون خانہ ہیں۔

زرین نے ممبرا کے پٹیل اسکول سے ایس ایس سی تک تعلیم حاصل کی ہے جبکہ گیارہویں اور بارہویں عبداللہ پٹیل جونیئر کالج سے کی۔ گریجویشن (بی کام) بھانڈوپ میں واقع ڈی اے وی کالج سے کیا۔ زرین نے بتایا کہ ''گریجویشن مکمل کرنے کے بعد ہی میں نے سی اے کورس میں داخلہ لے لیا تھا اور اس کی شروعات انٹرمیڈیٹ لیول (آئی پی سی)

سے کی تھی۔ میں نے جنوری 2020 سے ہی اپنی تیاری شروع کر دی تھی تا کہ مئی 2020 میں منعقد ہونے والے امتحان میں شرکت کر سکوں لیکن کورونا کے سبب یہ امتحان منسوخ ہو گیا تھا۔ یہ امتحان نومبر میں منعقد ہوا جہاں مجھے کامیابی کا پورا یقین تھا۔

(اقبال انصاری، iqbal@mid-day.com)

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

## کلیات جوش (جلد دوم، سوم)

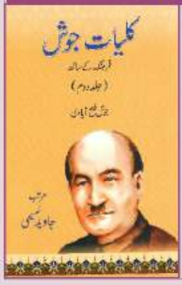


مرتب: جاوید نسیمی

صفحات: 974 (دوسری جلد)

514 (تیسری جلد)

قیمت: 425 روپے (دوسری جلد)

240 روپے (تیسری جلد)

## دکن میں اردو

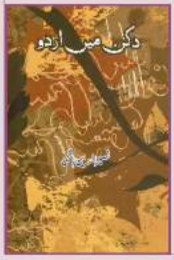


مصنف: نصیرالدین ہاشمی

پانچویں طباعت: 2020

صفحات: 945

قیمت: 340 روپے

## اردو کی صوتی لغت

مصنف: نصیر احمد خاں

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 1232

قیمت: 665 روپے

## ہندوستانی نظام قانون

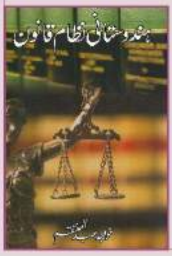


مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 381

قیمت: 190 روپے

## کشمیر کی وادی

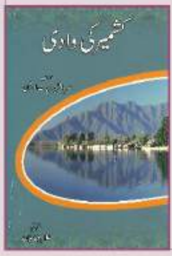


مصنف: سر والٹر روپرٹ لارنس

مترجم: غلام نبی خیال

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 587، قیمت: 217 روپے

## زراعت اور پیشہ ورانہ تعلیم

مصنف: سہراب علی، مترجم: ابوعبداللہ منصور

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 338

قیمت: 165 روپے

## تعلیمی نفسیات

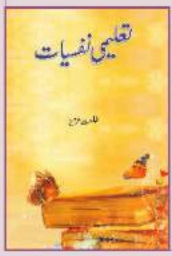


مصنف: طلعت عزیز

تیسری طباعت: 2020

صفحات: 242

قیمت 130 روپے

## منٹو کے نادر خطوط

تحقیق و ترتیب: فاروق اعظم قاسمی

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 62

قیمت: 55 روپے


شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

**Mahnama Khawateen Duniya Monthly March 2021, Vol. 5, Issue: 3**
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

**RNI. No. DELURD/2017/74026**
**ISSN 2581-4826**

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

# اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025